حیاتِ خسرو

مولانا شبلی مرحوم

حیاتِ خسرو

مولانا شبلی مرحوم

خدا کا شکر ہے

دائرۂ ادبیہ اپنی خدمات نہایت خوبی و خوش اسلوبی سے انجام دے رہا ہے۔ ایک طرف تو اردو کے مشہور مشہور مصنفین شبلی، حالی، آزاد وغیرہم کے علاوہ حتی الوسع تمام اردو مصنفوں کی کتابیں فراہم کرنا اور موجود رکھتا ہے۔ کوششیں جتنی مشکور ہوتی جاتی ہیں، اسیقدر وہ اپنا حلقۂ عمل وسیع کرتا جاتا ہے، اسکی فہرست میں فی الحال سولہ سو مصنفین کی کتابیں درج ہیں۔ شائقین کتب کو اسے ضرور ملاحظہ کرنا بلکہ اپنے پاس رکھنا چاہیئے۔ اس میں ہر ایک مصنف کے مختصر حالات بھی ہیں۔ ۱ر کا ٹکٹ ارسال کر کے طلب فرمائیں۔

دوسری طرف وہ بہترین کارآمد کتابیں شایع کرتا رہتا ہے، اس وقت تک حسب ذیل کتابیں دائرۂ ادبیہ سے اشاعت پا چکی ہیں۔

حزن اختر

واجد علی شاہ سلطان اودھ نے "آپ بیتی" کا ایک دردناک عبرت انگیز مرقع کھینچا تھا، حالات و مصائب زندان، قیدخانہ میں بیٹھے لکھے۔ آج وہ بالکل نایاب تھے دائرۂ ادبیہ نے فراہم کر کے، مولانا شرر کے مقدمہ کے ساتھ نہایت اہتمام سے لکھا چھپا کے، شاہ اودھ کے آخری عمر کے فوٹو سے مزین کر کے، خوبصورت مضبوط جلد میں شایع کر دیے، جسکے اوپر سنہری حروف میں کتاب کا نام منقش ہے قیمت مجلد اعلیٰ ۱۲ر غیر مجلد ۸ر

اسلام کا اثر یورپ پر

خود یورپ مصنفین کے اقوال سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ یورپ کا موجودہ شائستہ تمدن، قابل ناز ترقی علوم و فنون سب مسلمانوں کی کاوشوں اور انکے سامنے زانوے ادب تہ کرنیکا انعام ہے، حزن اختر کی طرح مجلد ۱۲ر قیمت غیر مجلد ۸ر

بسم اللہ

سلسلۂ دائرۂ ادبیہ نمبر ۳

حیات خسرو

مرتبہ

علامہ شبلی نعمانی مرحوم

سنہ ۱۹۲۲ء

دائرۂ ادبیہ لکھنؤ نے

ادبی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر

شائع کی

فہرست مضامین

حضرت امیر خسروؔ کا حال تمام تذکروں میں کسی قدر تفصیل سے پایا جاتا ہی۔ تاریخ فرشتہ میں بھی دلچسپ واقعات ہیں۔ لیکن خود امیر صاحب نے غرۃ الکمال کے دیباچہ میں جو مختصر حالات لکھے ہیں وہ سب سے زیادہ قابل اعتبار ہیں۔ جہاں تک اس میں مذکور ہیں میں نے اسی کو اپنا ماخذ قرار دیا ہی۔ امیر صاحب کی دیگر تصانیف سے بھی انکے واقعات معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ موقع بموقع انکے حوالے دیے جائیں گے۔ ڈاکٹر ریو نے برٹش میوزیم لندن کی قلمی کتابوں کی جو فہرست مرتب کی ہی اسمیں حضرت امیر خسروؔ کی تصنیفات سے ان کے حالات مرتب کئے ہیں کہیں کہیں اس سے بھی مدد لی گئی ہی۔

"شبلی"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حیاتِ خسروؒ

ولادت و تعلیم

ترکوں کا ایک قبیلہ لاچین کے لقب سے مشہور ہی حضرت امیر خسروؒ اسی قبیلے سے ہیں۔ انکے والد کا نام سیف الدین محمود ہی۔ ترکستان میں ایک شہر کش ہی۔ وہاں کے رہنے والے اور اپنے قبیلے کے رئیس تھے۔ فرشتہ۔ اور دولت شاہ نے لکھا ہو کہ بلخ کے امرا میں سے تھے۔ چنگیز خاں کا فتنہ جب اُٹھا تو سیف الدین ہجرت کر کے ہندستان میں آئے اور سلطان محمد تغلق کے دربار میں ایک بڑے عہدہ پر مامور ہوے۔ محمد تغلق اِن کی نہایت قدر و منزلت کرتا تھا۔ ایک مہم میں کفار سے لڑکر شہید ہو لیکن صاحب بہارستان سخن۔ تاریخی استدلال سے اِس واقعہ کا نا ممکن ہونا ثابت کر کے لکھتے ہیں۔

پس انچہ دولت شاہ در تذکرۂ خود نوشتہ کہ پدر امیر خسروؒ در عہد سلطان محمد تغلق شہید شدہ و امیر خسرو را در حق وے قصائد است

خلاف صریح ومحض غلط است غالبًا شاہزادہ سلطان محمد شہید را
کہ حاکم ملتان بود بعلت اشتراک اسمی محمد تغلق خیال کردہ"

بہرحال سیف الدین کے تین بیٹے تھے - اعزالدین علی شاہ - حسام الدین
اور امیر خسرو[1] - سیف الدین کے انتقال کے وقت امیر صاحب کی عمر ۹ برس کی
تھی - امیر صاحب کی والدہ عماد الملک کی بیٹی تھیں جو مشہور امرائے شاہی میں تھے
اور دس ہزار فوج کے افسر تھے - امیر صاحب ۶۵۱ھ میں بمقام پٹیالی[2] پیدا ہوئے
قدیم خوش اعتقادی نے یہ روایت پیدا کی کہ جب وہ پیدا ہوئے تو امیر سیف الدین
ایک خرقہ میں لپیٹ کر ایک مجذوب کے پاس لے گئے - مجذوب نے دور ہی سے
دیکھکر کہا کہ "وہ شخص آتا ہے جو خاقانی سے بھی دو قدم آگے جائیگا" مجذوب
صاحب کے کمالات کا ہم انکار نہیں کرتے لیکن انکے شاعرانہ مذاق کا تسلیم
کرنا مشکل ہے - خاقانی کو امیر خسرو سے کیا نسبت -

---

[1] والہ داغستانی اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ امیر خسرو باپ کے ساتھ غزنین کے اطراف سے
ہندوستان میں آئے اور پھر لکھتے ہیں کہ بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ امیر خسرو کی ماں حاملہ آئی تھیں خسرو دہلی
میں پیدا ہوئے لیکن پہلی روایت بظاہر صحیح ہے۔ تمام واقعات تاریخی سے ثابت ہے کہ خسرو ہندوستان ہی میں پیدا ہوئے
ہیں لیکن والہ داغستانی کو کیونکر گوارا ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کی خاک سے ایسا شخص پیدا ہو۔

[2] پٹیالی ضلع ایٹہ کمشنری آگرہ میں چھوٹا سا قصبہ ہے۔ پہلے یہی مقام ضلع کا صدر تھا اب ایٹہ ہے۔
کسی زمانہ میں دریائے گنگا اسکے نیچے بہتا تھا لیکن اب سیلوں کا فاصلہ ہے۔ یہاں اب اسٹیشن بھی ہے ۱۲

جب انھوں نے ہوش سنبھالا تو انکے والد نے انکو مکتب میں بٹھایا اور خوشنویسی کی مشق کے لئے مولانا سعد الدین خطاط کو مقرر کیا لیکن امیر صاحب کو پڑھنے لکھنے کے بجائے شعرگوئی کی دھن رہتی تھی۔ جو کچھ موزون ناموزوں کہہ سکتے تھے کہتے تھے اور وصلیوں پر اسی کی مشق کرتے تھے۔ خواجہ اصیل کوتوال کے نائب تھے۔ وہ کبھی کبھی سعد الدین خطاط کو خطوط وغیرہ لکھوانے کو بلالیا کرتے تھے۔ ایک دن بلایا تو امیر صاحب بھی ساتھ گئے۔ خواجہ اصیل کے مکان پر خواجہ عزیز الدین بھی تشریف رکھتے تھے۔ سعد الدین نے خواجہ صاحب سے کہا کہ یہ لڑکا ابھی سے کچھ غوں غاں کرتا ہے۔ معلوم نہیں کہ موزوں بھی کہتا ہے کہ نہیں؟ آپ ذرا اسکے کلام کو سن لیجئے۔ خواجہ عزیز کے ہاتھ میں اشعار کی بیاض تھی۔ امیر صاحب کو دی کہ کوئی شعر پڑھو۔ امیر صاحب نے نہایت خوش الحانی سے پڑھا۔ چونکہ آواز میں قدرتی تاثیر تھی، لوگوں پر اثر ہوا۔ سب کی آنکھیں بھر آئیں۔ اور سب نے بے اختیار تحسین کی۔ انکے استاد نے کہا شعرگوئی میں امتحان لیجئے۔ خواجہ عزیز الدین نے چار بے جوڑ چیزوں کا نام لیا کہ انکو ملا کر شعر کہو۔ مو۔ بیضہ۔ تیر۔ خربزہ۔ امیر صاحب نے برجستہ کہا۔

ہر موئے[1] کہ در دو زلف آن صنم است

صد بیضۂ عنبرین بر آن موئے ضم است

---

[1] جس نسخہ سے یہ رباعی نقل کی ہے وہ غلط تھا میں نے اسی طرح نقل کر دیا ۱۲

میل تیر بداں رأس دلش را زیرا کہ :
چوں خربزہ دندانش درون شکم است

خواجہ عزیزالدین کو سخت حیرت ہوئی - پوچھا نام کیا ہے؟ اُنھوں نے کہا خسرو - باپ کا نام پوچھا اُنھوں نے اصل نام کے بجاے قبیلہ کا نام تبایا یعنی لاچین - خواجہ صاحب نے ظرافت سے کہا لاچین یعنی "چین نہیں" پھر کہا "ترک خطاست" یعنی انکو ترک کہنا خطا ہی؟ انھوں نے اسی نقط کو الٹ کر کہا "بخطا ترک است" یعنی قطعاً وہ ترک ہی - خواجہ صاحب نے کہا چونکہ تم کو دربار سلطانی سے تعلق ہی اسلیئے تمکو سلطانی تخلص رکھنا چاہیئے - چنانچہ تحفۃ الصغر[1] کی اکثر غزلوں میں یہی تخلص ہی -

امیر صاحب کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی کی تحصیل تمام تھی لیکن تذکرہ نویسوں نے اسکے متعلق کچھ تفصیل نہیں لکھی - تاہم یہ قطعی ہی کہ ۱۵ یا ۲۰ برس کی عمر میں یہ تمام درسی علوم و فنون سے فارغ ہو چکے تھے -

درباری تعلقات امیر خسرو صاحب سن رشد کو پہونچے تو دہلی کے تخت پر سلطان غیاث الدین بلبن صدر نشین تھا - جو ۶۶۴ھ میں تخت حکومت پر بیٹھا تھا - اسکے امراے دربار میں سے

---

[1] یہ تمام حالات اپنے امیر صاحب نے خود تحفۃ الصغر میں لکھے ہیں ۱۲

کتلو خاں معروف بہ چھجو[1] بہت بڑے رتبہ کا سردار تھا۔ وہ سلطان کا بھتیجا اور بلبن کے عہدے پر مامور تھا۔ فرشتہ میں لکھا ہے کہ مجلس آرائی اور جود و کرم کی وجہ سے حاتم کی طرح مشہور ہو گیا تھا۔ اور مصر۔ شام۔ روم۔ بغداد۔ عراق۔ خراسان۔ ترکستان وغیرہ سے اہل کمال اور شعرا اسکے دربار میں آتے تھے اور کامیاب ہو کر جاتے تھے۔ بارہا ایسا اتفاق ہوا کہ جو کچھ نقد و اسباب سامان تھا سب لٹا دیا۔ یہانتک کہ خود اسکے بدن پر پیراہن کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔

امیر صاحب کو جیسا کہ خود غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھا ہے۔ سب سے

---

[1] چھجو خاں کا نام تاریخوں میں اسطرح مختلف لقب اور خطاب سے آتا ہے کہ دھوکا ہوتا ہے۔ کہ ایک شخص ہے یا کئی ہیں۔ امیر خسرو غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ میں نانا کی وفات کے بعد سب سے پہلے خان معظم کشلو خان عرف چھجو کے دربار میں پہونچا۔ اس سے اسقدر ثابت ہوا کہ کشلو اور چھجو ایک ہی شخص ہیں۔ بدایونی صفحہ ۸۰ طبع اول میں ہے کہ چھجو آخر میں کڑہ ملک نور کے ساتھ سامانہ کا حاکم مقرر ہوا تھا۔ اور سلطان معز الدین کیقباد نے اس کی بیٹی سے شادی کی تھی۔ فرشتہ میں لکھا ہے کہ علاء الدین محمد بن اعز الدین بالخان غیاث الدین بلبن کا برادر زادہ تھا۔ سلطان نے اسکو باربک مقرر کر کے خان اعظم کو کشلی خان کا خطاب دیا۔ بدایونی صفحہ ۱۶۲ میں ملک چھجو کو برادر زادہ سلطان غیاث الدین لکھکر لکھا ہے کہ اسکو کشلو خان خطاب ملا تھا۔ ان تمام عبارتوں کو ملاؤ تو ثابت ہوگا کہ علاء الدین کشلو خاں۔ چھجو ایک ہی شخص ہیں ۱۲

پہلے اسکے دربار میں رسائی حاصل ہوئی اور دو برس تک اسکے دربار میں ملازم رہے۔ چنانچہ اکثر قصیدے اسکی مدح میں لکھے ہیں۔ ایک قصیدہ میں مدح کی تمہید لکھتے ہیں۔

بود پنہاں آفتاب آں دم کہ صبح ۔۔۔ ہمدمی با باد عنبر بو نمود
صبح را گفتم کہ خورشید کجا ست ۔۔۔ آسماں روئے ملک چھجو نمود

امیر صاحب نے مثنوی نہ سپہر میں لکھا ہے۔

زشاہاں کسے کاولم کرد یاد ۔۔۔ معز الدین بود شہ کیقباد

لیکن اس سے کشلو خاں کی اولیت پر حرف نہیں آتا۔ کشلو خاں امرا میں سے تھا۔ بادشاہ نہ تھا بادشاہوں میں سے البتہ سب سے پہلے جس نے امیر صاحب کی قدردانی کی وہ معز الدین کیقباد تھا۔ امیر صاحب اکثر کشلو خاں کے دربار میں قصیدے لکھکر لیجاتے اور مجلس گرم کرتے تھے۔

ایک دن اتفاق سے بغرا خاں (سلطان غیاث الدین بلبن کا بیٹا) موجود تھا اور شعر و شاعری کے چرچے ہو رہے تھے۔ شمس الدین دبیر۔ اور قاضی اثیر جو مشہور شعرا میں سے تھے وہ بھی حاضر تھے۔ امیر صاحب نے اپنی زمزمہ سنجی سے وہ سماں باندھا کہ بغرا خاں نہایت متاثر ہوا۔ اور صلہ کے طور پر لگن بھر کر روپے دیے۔ کشلو خاں کو یہ ناگوار ہوا کہ اسکا ولیعہد دولت دوسرے دربار کا احسان اٹھائے چہرہ سے ملال کے آثار ظاہر ہوئے۔

امیر صاحب نے اسکے بعد بار بار مختلف موقعوں پر اسکی تلافی کرنی چاہی لیکن کتلو خاں کے دل سے وہ پھانس نہ نکلی۔

بغرا خاں سامانہ کا حاکم تھا۔ امیر صاحب نے ملک چھجو سے مایوس ہو کر سامانہ کا قصد کیا۔ بغرا خاں نے نہایت قدر و عزت کی اور ندیم خاص بنایا۔ اسی زمانہ یعنی ۶۷۸ھ میں لکھنوتی (بنگال) میں طغرل نے بغاوت کی اور شاہی لشکر کو بار بار شکستیں دیں۔ بالآخر سلطان غیاث الدین بلبن نے خود اس مہم پر جانے کی طیاریاں کیں اور بغرا خاں کو ساتھ لیا۔ امیر صاحب بھی اس سفر میں ساتھ گئے۔ سلطان غیاث الدین اس بغاوت کو فرو کر کے دلی واپس آیا اور بنگالہ کی حکومت بغرا خاں کو عنایت کی۔ امیر صاحب کو اب زیادہ امن و اطمینان کا موقع حاصل تھا۔ دربار کے شعرا شمس الدین دبیر اور قاضی اثیر بھی انکے قیام پر مصر تھے۔ لیکن وہ دلی کو بنگال کے معاوضہ میں نہیں دے سکتے تھے۔ چنانچہ رخصت لیکر دلی میں آئے۔ اتفاق سے

سنہ یہ تمام حالات خود امیر صاحب نے غرۃ الکمال کے دیباچہ مین لکھے ہیں ۱۲ سلہ تاریخ فرشتہ ۱۲ سلہ امیر خسرو نے غرۃ الکمال کے دیباچہ میں ان واقعات کو خود لکھا ہی لیکن اسقدر بےترتیب لکھا ہی کہ بڑی مشکل سے اور تاریخوں کے باہم مقابلہ کرنے سے اصل حال کا پتہ چلتا ہے۔ ایک اور دقت سخت تر یہ ہی کہ غرۃ الکمال کا جو نسخہ میرے پیش نظر ہے نہایت غلط اور گویا بالکل مسخ ہی ۱۲

اسی زمانہ میں سلطان غیاث الدین کا بڑا بیٹا ملک محمد قاآن (مشہور بہ خان شہید) دلی میں آیا تھا۔ وہ نہایت قابل، صاحب علم، فیاض اور قدردان علم و فن تھا۔ تہذیب و متانت کا یہ حال تھا کہ جب دربار میں بیٹھتا تو گو کبھی کبھی دن کا دن گزر جاتا تھا لیکن زانو نہیں بدلتا تھا۔ اسکی مجلس میں ہمیشہ شاہنامہ۔ دیوان خاقانی۔ انوری۔ خمسہ نظامی کے اشعار پڑھے جاتے تھے۔ ایک بیاض جس میں اپنے مذاق کے موافق بیس ہزار شعر انتخاب کرکے درج کئے تھے۔ تاریخ فرشتہ میں لکھا ہو اُن اشعار کے حسن انتخاب پر امیر صاحب اور خواجہ حسن دہلوی بھی داد دیتے تھے۔ یہ بیاض ایسی نادر چیز تھی کہ جب شاہزادہ کا انتقال ہوا تو سلطان غیاث الدین نے اپنے خاص دوات دار امیر علی کو دی۔ امیر علی کے بعد امیر صاحب کے ہاتھ آئی۔ ارباب ذوق اسکی نقلیں لیتے تھے اور بیاضوں میں درج کرتے تھے (تاریخ فرشتہ)

امیر صاحب کی شاعری کا شہرہ ہو چکا تھا۔ سلطان محمد نے انکو بلاکر شعرائے خاص میں داخل کیا۔ اور جب وہ ملتان کا حاکم مقرر ہو گیا تو انکو اور انکے ساتھ خواجہ حسن دہلوی کو بھی ساتھ لے گیا۔ پانچ برس تک یہ اسکے دربار میں رہے۔ اس زمانہ میں ہلاکو خاں کا پوتا ارغو خاں ایران کا حکمراں تھا۔ اسکے امرا میں سے تیمور خاں بیس ہزار سوار لیکر لاہور اور دیپالپور کو فتح اور غارت کرتا ہوا ملتان کی طرف بڑھا۔ سلطان محمد قاآن نے

ملتان سے نکلکر تیمور خاں کو شکست دی۔ لیکن چونکہ ظہر کی نماز نہیں پڑھی تھی ایک تالاب کے کنارے پانچ سو آدمیوں کے ساتھ نماز میں مشغول ہوا۔ موقع پاکر تاتاریوں نے دو ہزار کی جمعیت کے ساتھ حملہ کیا۔ سلطان محمد نے انہی نمازیوں کے ساتھ نماز سے فارغ ہوکر تاتاریوں کا مقابلہ کیا۔ اور گو بار بار انکو شکستیں دیں۔ لیکن اتفاق سے ایک تیر آکر لگا اور زخم کھاکر مر گیا[۵]

امیر صاحب اور خواجہ حسن دہلوی بھی اس معرکہ میں شریک تھے چنانچہ تاتاری انکو گرفتار کرکے بلخ لے گئے۔ یہ واقعہ ۶۸۳ھ میں پیش آیا۔ امیر صاحب نے نہایت پُراثر مرثیے لکھے اور دلی بھیجے۔ مہینوں تک لوگ گھر گھر ان مرثیوں کے اشعار پڑھتے تھے اور اپنے مقتول عزیزوں پر نوحہ کرتے تھے۔ چند اشعار ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

واقعہ است ایں یا بلا از آسماں آمد پدید ۔۔۔ آفت است ایں یا قیامت در جہاں آمد پدید
ماہ در بنیاد عالم داد سیل فتنہ زا ۔۔۔ رخنۂ کامسال در ہندوستاں آمد پدید
مجلس یاراں پریشاں شد چو برگ گل ز باد ۔۔۔ برگ ریزی گوئی اندر بوستاں آمد پدید
بسکہ آب چشم خلقے شد رواں در چار سو ۔۔۔ پنج آب دیگر اندر مولتاں آمد پدید
جمع شد سیارہ در چشم گر طوفاں شود ۔۔۔ چوں بہ برج آبی انجم را قراں آمد پدید
من نخواہم جز جہاں جمعیت وایں کے شود ۔۔۔ خود محال ست ایں بنات النعش پرویں کے شود

---

[۵] تاریخ فرشتہ ۱۲ سطر ۵ بدایونی صفحہ ۱۳۱ - ۱۲

تا چہ ساعت بُد کہ شاہ از مولتاں لشکر کشید | تیغ کافر کش بدست کین کافر کشید
انچہ حاضر بود لشکر لشکر دیگر نہ جست | زانکہ رستم را نشاید منت لشکر کشید
چوں خبر کردندش از دشمن بُاں قوت کہ داشت | بے محابا باحشم در سر گرد و رایت بر کشید
یک کششش از مولتانش تا بہ لاہور او فتاد | یعنی اندر عہد من کافر تو اند سر کشید
آنچناں رنگیں کنم سال خاک از خون شاں | کز زمیں بایدشفق را گونہ احمر کشید
اور دریں تدبیرہ آگہ نے کہ تدبیر فلک | صفحۂ تدبیر را خط مشیت در کشید

تا چہ ساعت بُد کہ کافر بر سر لشکر کشید
میگذشتند جوق جوق از آب دناگہ در کشید

بہت بڑا مرثیہ ہے اور لڑائی کی تمام کیفیت لکھی ہے۔ اخیر کے بند۔ جہاں شاہزادہ کی شہادت کا ذکر ہے نہایت پر اثر ہیں،

دو برس کے بعد امیر صاحب نے کسی طرح تاتاریوں کے ہاتھ سے رہائی پائی اور دلّی میں آئے۔ خان شہید کے مرنے پر جو نوحہ لکھا تھا غیاث الدین بلبن کے دربار میں جا کر پڑھا۔ دربار میں کہرام پڑ گیا۔ کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا۔ سلطان اس قدر رویا کہ بخار آگیا اور بالآخر اسی صدمہ میں انتقال کر گیا۔

امیر دلی سے پٹیالی میں آئے اور گنگا کے کنارے قیام پذیر ہوئے۔ ۶۸۶ھ میں سلطان غیاث الدین بلبن نے وفات پائی اور درباریوں نے اسکے خلاف وصیت۔ اسکے پوتے کیقباد کو جو بغرا خان کا بیٹا تھا تخت نشین کیا۔

کیقباد نے امیر صاحب کو دربار میں طلب کیا۔ لیکن چونکہ عنان سلطنت ملک نظام الدین کے ہاتھ میں تھی۔ اور وہ امیر صاحب سے صاف نہ تھا۔ امیر صاحب نے تعلق پسند نہ کیا اور خان جہاں جو امرائے قدیم میں تھا، اسکی ملازمت اختیار کی۔

خان جہاں اودھ کا صوبہ دار مقرر ہوا اور امیر صاحب کو ساتھ لیگیا۔ چنانچہ خود قران السعدین میں فرماتے ہیں۔

خان جہاں حاتم مفلس نواز	گشت باقطاع اودھ سرفراز
من کہ بدم چاکر او پیش ازاں	کرد کرم آنچہ کہ بد بیش ازاں
تا ز چناں بخشش خاطر فریب	بندہ شدہ لازمۂ آں رکیب
در اودھم بردہ ز لطف چناں	کیست کہ از لطف بتابد عناں
در اودھ از بخشش او تا دو سال	ہیچ غم و نالہ بنود از منال

دو برس تک اودھ میں رہے۔ انکی والدہ کو ان سے حد سے زیادہ محبت تھی۔ وہ دلی میں تھیں۔ اور انکے خطوط آتے رہتے تھے کہ میں تم سے دور رہکر زندہ نہیں رہ سکتی۔ امیر صاحب کو بھی ماں سے بے انتہا محبت تھی۔ چنانچہ سب تعلقات چھوڑکر دلی میں آئے۔ ماں نے گلے سے لگایا۔ اور آنکھوں سے محبت کے دریا بہائے۔

مادرم آں خستۂ تیمار من	چوں نظر افگند بہ دیدار من
بہر دو رسن شفقت برگرفت	اشک فشاناں بدرم در گرفت

کیقباد جب تخت سلطنت پر بیٹھا تو عیاشی اور رندی شروع کی۔ اسکا باپ بغرا خاں بنگال میں تھا۔ یہ حالت سنکر بنگال سے روانہ ہوا۔ کیقباد نے ناخلفی سے باپ کا مقابلہ کرنا چاہا۔ چنانچہ ایک عظیم الشان فوج تیار کرکے دلی سے روانہ ہوا۔ راہ میں نامہ و پیغام ہوتے رہے۔ آخر صلح پر خاتمہ ہوا اور کیقباد دلی کو واپس گیا۔

امیر صاحب نے باپ بیٹے کے اتحاد اور مصالحت پر ایک قصیدہ لکھا جس کے چند شعر یہ ہیں۔

زہے ملک خوش چوں دو سلطاں یکے شد | زہے عہد خوش چوں دو پیماں یکے شد
پسر بادشاہے۔ پدر نیز سلطاں۔ | کنوں ملک بیں چوں دو سلطاں یکے شد
زمہو جہانداری و بادشاہی۔ | جہاں را دہ شاہ جہانباں یکے شد
یکے ناصر عہد۔ محمود سلطاں | کہ فرمانش در چار ارکاں یکے شد
دگر شد معز جہاں کیقبادے | کہ در ضبطش ایران و توراں یکے شد

کیقباد چاہتا تھا کہ یہ واقعات نظم کے پیرایہ میں آئیں۔ امیر صاحب کو بلا کر یہ خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ امیر صاحب نے چھ مہینے کی مدت میں قران السعدین لکھی۔ جس میں باپ بیٹے کی مراسلات اور ملاقات کا حال تفصیل سے لکھا ہے۔ اُس وقت امیر صاحب کی عمر ۳۶ برس کی تھی اور سنہ ۶۸۸ھ تھا[1]

---

[1] بدایونی ۱۲

چنانچہ خود فرماتے ہیں۔

ساختہ گشت از روش خامۂ | از پس شش ماہ چنیں نامۂ
در رمضان شد بسعادت تمام | یافت قران نامۂ سعدین تمام
آنچہ بتاریخ ز ہجرت گذشت | بود سن ششصد و ہشتاد و ہشت
سال من امروز اگر بررسی | راست بگویم ہمہ شش بود و سی

کیقباد عیاشی میں بیمار ہو کر تین برس حکومت کے بعد ۶۸۹ھ میں مرگیا یا
مارا گیا۔ اسکے بعد اسکا خورسال بیٹا شمس الدین کیکاؤس تخت نشین ہوا۔
وہ بالکل بچہ تھا۔ تین مہینے کے بعد امرائے دربار نے تخت سے اتار کر قید کر دیا۔
اب خاندان میں کوئی شخص دعویدار سلطنت نہیں رہا تھا۔ اسلیئے ترکی امرائے
دربار میں سے ملک فیروز شایستہ خاں خلجی جس کی عمر ۷۰ برس کی تھی۔ اور
جس نے دربار میں بڑا اثر حاصل کیا تھا۔ تخت سلطنت پر بیٹھا۔ اور سلطان
جلال الدین خلجی کے نام سے مشہور ہوا۔ وہ بڑے عظمت و اقتدار و جاہ و
جلال کا بادشاہ تھا۔ اسکے ساتھ نہایت صاحب مذاق۔ رنگین طبع۔ خوش
صحبت تھا۔ شعر بھی کہتا تھا۔ چنانچہ بدایونی نے اسکے دو شعر بھی نقل کئے ہیں۔

آں زلف پریشانت ژولیدہ نمی خواہم | واں روی چو گلزارت تفسیدہ نمی خواہم
لب بر سر لب خواہم یک شب بکنار آئی | ہاں تا نگہ بندت یک بوسہ نمی خواہم

احباب اور شریک صحبت بھی جسقدر تھے۔ سب قابل اہل فن موزوں طبع

اور رنگین مزاج تھے۔ مثلاً ملک تاج الدین کرچی۔ ملک فخرالدین۔ ملک اعزالدین۔ ملک قرابگ۔ ملک نصرت۔ ملک حبیب۔ ملک کمال الدین ابو المعالی۔ ملک نصیرالدین کمرانی۔ ملک سعدالدین۔ انسپل دہم صحبت تھے۔ اسی طرح اکثر بڑے بڑے اہل کمال ندیمی کے لئے انتخاب کئے تھے۔ چنانچہ تاج الدین عراقی۔ خواجہ حسن دہلوی۔ موید جاجرمی۔ موید دیوانہ امیر۔ ارسلان۔ اختیار الدین باقی۔ ندماے خاص میں تھے۔ ساقی۔ مغنی۔ اور مطرب بھی وہ لوگ تھے۔ مثلاً امیر خاصہ۔ حمید۔ راجہ نظام محمد شاہ۔ نصیر خاں۔ بہروز۔

ایسے گوناگوں صاحب مذاق بادشاہ کے دربار کے لئے امیر صاحب سے زیادہ کون موزوں ہو سکتا تھا۔ عالم بھی تھے۔ فاضل بھی۔ مغنی بھی۔ مطرب بھی۔ اور شاعر تو تھے ہی۔ معزالدین کیقباد کے زمانہ میں جب سلطان جلال الدین عارض تھا۔ اُسی وقت اُسنے امیر صاحب کو قدر دانی کی نگاہ دیکھا تھا۔ چنانچہ معقول مشاہرہ مقرر کر کے خاص اپنا لباس عنایت کیا تھا تخت پر بیٹھا تو امیر صاحب کو ندیم خاص بنایا اور مصحف داری[۱] اور عمارت کا عہدہ دیا۔ اسکے ساتھ جامہ اور کمر بند جو امرائے کبار کا مخصوص لباس تھا اُنکے لئے مقرر کیا۔ امیر صاحب امیر کے خطاب سے پکارے جاتے ہیں

[۱] تاریخ فرشتہ ص ۱۰۵ جنکو قرآن مجید لکھنے کی خدمت سپرد ہوتی تھی اُنکو مصحف دار کہتے تھے ۱۲

اس کی وجہ یہی ہے۔
امیر صاحب نے جلال الدین خلجی کے تمام فتوحات نظم کیے! ورتاج الفتوح نام رکھا۔ اسکی تفصیلی کیفیت آگے آئیگی۔ جلال الدین خلجی کو اسکے بھتیجے سلطان علاء الدین خلجی نے ۶۹۵ھ میں دھوکے سے قتل کرا دیا۔ اور خود تخت نشین ہوا۔ سلطان علاء الدین نے اگرچہ دغا اور بیرحمی سے تخت سلطنت حاصل کیا تھا اور اگرچہ سخت دلی اور سفاکی اسکی طینت کا جوہر تھا۔ تاہم بہت بڑے عزم استقلال۔ شوکت وشان کا فرمانروا گذرا ہے تعجب انگیز فتوحات اور انتظامی کارناموں کو چھوڑکر علمی فیاضیاں بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں۔ اسکا دربار فقرا علماء فضلا شعرا سے ہر وقت معمور رہتا تھا۔ ان میں بعض کے نام حسب ذیل ہیں[۱]۔
قاضی فخر الدین ناقلہ۔ قاضی فخر الدین کرمانی۔ مولانا نصیر الدین غنی مولانا تاج الدین مقدم۔ قاضی ضیاء الدین۔ مولانا ظہیر الدین لنگ۔ مولانا ظہیر الدین بھکری۔ قاضی زین الدین ناقلہ۔ مولانا تاسرکتی۔ مولانا نصیر الدین رازی۔ مولانا علاء الدین صدر شریف۔ مولانا میراں ایک کلہ۔ مولانا نجیب الدین بدایونی۔ مولانا شمس الدین۔ مولانا صدر الدین۔ مولانا علاء الدین لاہوری۔ قاضی شمس الدین کازرونی۔ مولانا شمس الدین یحیٰی۔ مولانا شمس الدین

---

[۱] یہ فہرست بدایونی سے ماخوذ ہے ۱۲

مولانا صدر الدین بادہ ۔ مولانا معین الدین لولوی ۔ مولانا افتخار الدین رازی
مولانا معیر الدین اندربنی ۔ مولانا نجم الدین ۔ مولانا حمید الدین بلوری ۔
مولانا علاء الدین کرک ۔ مولانا حسام الدین سادہ ۔ محی الدین کاشانی مولانا
کمال الدین کولوہی ۔ مولانا وجیہ الدین کابلی ۔ مولانا منہاج الدین ۔ مولانا
نظام الدین کلاتی ۔ مولانا نصیر الدین کری ۔ مولانا نصیر الدین بوبی ۔ مولانا
علاء الدین تاجر ۔ مولانا کریم الدین جوہری ۔ مولانا محب ملتانی مولانا حمید الدین
مولانا برہان الدین بھکری ۔ مولانا افتخار الدین ۔ مولانا حمید الدین ملتانی ۔
مولانا گل محمد شیرازی ۔ مولانا حسام الدین سرخہ ۔ مولانا شہاب الدین ملتانی ۔
مولانا فخر الدین نسوی ۔ مولانا فخر الدین شقاقلی ۔ مولانا علیم الدین ۔

قرا ۔ مولانا نشاطی ۔ مولانا علاء الدین سفری ۔ خواجہ زکی ۔

واعظین ۔ مولانا حسام الدین درویش ۔ مولانا شہاب الدین ۔ مولانا کریم ۔

شعرا ۔ خواجہ حسن دہلوی ۔ صدر الدین عالی ۔ فخر الدین قواس
حمید الدین راجہ ۔ مولانا عارف عبد الحکیم ۔ شہاب الدین ۔ لیکن امیر صاحب کے
آفتاب کمال نے ان ستاروں کو بے نور کر دیا تھا ۔

چنانچہ اس وسیع مرقع میں صرف امیر صاحب کی تصویر نمایاں نظر آتی
ہے ۔ انکے بعد اگر کسی کے خط و خال پہچانے جاتے ہیں تو خواجہ حسن ہیں
وہ بھی امیر صاحب ہی کا فیض ہے ۔ علاء الدین نے امیر صاحب کا ایک ہزار

سالانہ ٹنکہ[۱] مقرر کیا تھا۔ امیر صاحب نے سلطان علاء الدین کی تمام فتوحات کو
نہایت تفصیل سے لکھا۔ جسکا نام خزائن الفتوح ہے تفصیل آگے آئیگی۔
۶۹۸ھ میں امیر صاحب کی والدہ اور انکے بھائی حسام الدین نے
انتقال کیا۔ لیلیٰ مجنوں میں اس واقعہ کو نہایت پُر درد مرثیہ کی صورت میں
لکھا ہے۔ نظامی کی پنج گنج کا جواب اسی زمانہ میں لکھا چنانچہ ہر کتاب
سلطان علاء الدین کے نام سے معنون ہے سب سے آخر کی مثنوی ہشت بہشت
ہے جو ۷۰۱ھ میں تمام ہوئی۔

اسی زمانہ میں امیر صاحب نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیا (محبوب الٰہی)
کے ہاتھ پر بعیت کی تفصیل آگے آئیگی۔ سلطان علاء الدین نے ۲۱ برس
کی حکومت کے بعد ۷۱۶ھ میں وفات پائی۔ اسکے بعد اسکا بیٹا شہاب الدین
(مدت حکومت ۳ ماہ) اور اسکے بعد ۷۱۶ھ میں قطب الدین مبارک بن علاء الدین
خلجی بادشاہ ہوا۔ وہ اگرچہ نہایت عیاش بے مغز اور سبک سر تھا لیکن
امیر صاحب کی قدر دانی سب سے بڑھکر کی۔ چنانچہ امیر صاحب نے جب
۷۱۸ھ میں اسکے نام پر مثنوی نہ سپہر لکھی تو ہاتھی برابر تول کر روپے دیے
خود امیر صاحب قطب الدین کی زبان سے کہتے ہیں۔

بتاریخ ہمچوں من اسکندرے کند ہر کہ آرائش دفترے

---

[۱] تاریخ فرشتہ۔ غالباً یہ طلائی سکہ ہوگا"

ز گنج گراں مایۂ بے شمار | دہم بار بخشش نہ آں پیلبار
مرا خود دریں رہ پدر شد دلیل | کہ میداد زر - ہم ترازوئے پیل
شناسد کسے کش خرد رہنموں | کہ از پیلبار است زرپش فزوں
چو میراث شد پیل زر دادنم | نہ زیباست زیں سہل تر دادنم
شہا! گنج بخشا! کرم گسترا! | معانی شناسا سخن دادرا!
چنیں بخششے کز تو جم یافتم | در ایام پیشینہ کم یافتم
کنوں لابد از سحر سنج چو من | بہ اندازۂ بخشش آمد سخن

قطب الدین خلجی نے ایک ہندو نو مسلم غلام کو خسرو خاں کا خطاب دیکر قلمدان وزارت عطا کیا تھا۔ اُسنے ۷۲۱ھ میں قطب الدین کو قتل کر کے خود تخت حکومت پر جلوس کیا۔ چونکہ اس نے دربار میں تمام ہندو بھر دیئے اور خاندان شاہی پر طرح طرح کے ظلم کئے۔ امرائے بغاوت کی۔ چنانچہ چار مہینے کی حکومت کے بعد ۷۲۰ھ میں غازی ملک کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ اب خلجی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ اور امرائے دربار میں سے غازی ملک نے جس کا باپ سلطان غیاث الدین بلبن کا ترکی غلام اور ماں اس کی ہندنی تھی۔ دربار میں پکار کر کہا کہ مجکو تخت سلطنت کی آرزو نہیں۔ خاندان شاہی سے کسی کو تخت نشین کیا جائے۔ لیکن چونکہ خلجی خاندان میں سے کوئی شخص باقی نہیں رہا تھا اور ملک غازی کی خدمات کا تمام دربار معترف تھا اسلیے

سب نے باتفاق اسی کو بادشاہ بنایا ۔ وہ سلطان غیاث الدین تغلق کے نام سے مشہور ہوا ۔ اس نے نہایت عدل و انصاف سے حکومت کی اور نئی نئی فتوحات حاصل کیں ۔ تغلق آباد کا مشہور قلعہ اسی کی یادگار ہے ۔ امیر صاحب کی اس نے نہایت قدر دانی کی اور ان کو مال و دولت سے نہال کر دیا ۔ امیر صاحب نے بھی اس کے احسانات کا حق ادا کیا ۔ چنانچہ اس کے نام پر تغلق نامہ لکھا ۔ جو تغلق کے عہد حکومت کی مفصل تاریخ ہے ۔

وفات اعزہ و اولاد

تغلق نے جب بنگال کا سفر کیا تو امیر صاحب ساتھ گئے ۔ تغلق واپس آیا ۔ لیکن امیر صاحب وہیں رہ گئے ۔ اسی اثنا میں خبر مشہور ہوئی کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا نے انتقال کیا ۔ امیر صاحب یلغار کرتے ہوئے دلی میں آئے ۔ اور جو کچھ زر و مال پاس تھا خواجہ صاحب کے نام پر نثار کر دیا ۔ ماتمی سیاہ کپڑے پہن کر خواجہ صاحب کی قبر پر مجاور ہو بیٹھے ۔ چھ مہینے کے بعد ذیقعدہ ۷۲۵ھ میں انتقال کیا ۔ خواجہ صاحب نے وصیت کی تھی کہ خسرو کو میرے پہلو میں دفن کرنا ۔ لوگوں نے اس وصیت کی تعمیل کرنی چاہی ۔ لیکن ایک خواجہ سرا نے جو وزارت کا منصب رکھتا تھا کہا کہ لوگوں کو دونوں قبروں کی تمیز کرنے میں دھوکا ہوگا ۔ غرض خواجہ صاحب کی پائنتی دفن کیا ۔ اور اس سے بڑھکر ان کی کیا خوش قسمتی ہو سکتی تھی ۔ انکا مقبرہ مہدی خواجہ نے جو سلطان بابر کے امرا میں سے تھا

تعمیر کرایا اور ملا شہاب معمائی نے تاریخ لکھکر لوح پر کندہ کرائی۔

شد عدیم المثل یک تاریخ او　　　داں دگر شد طوطی شکر مقال

امیر صاحب کو خدانے فرزندان معنوی کے علاوہ اور اولاد ظاہری بھی عنایت کی تھی۔ ان کے ایک صاحبزادے کا نام ملک احمد ہے۔ وہ شاعر تھے اور سلطان فیروز شاہ کے دربار میں ندیم تھے۔ ان کی شاعری نے چنداں فروغ نہیں حاصل کیا لیکن شعر اور شاعری کے دقائق سے خوب واقف تھے اشعار کے عیب و ہنر کو خوب پرکھتے تھے۔ اور نہایت نازک اور دقیق نکتے پیدا کرتے تھے۔ چنانچہ اکثر اساتذہ کے اشعار پر جو حرف گیریاں کیں عموماً اہل فن اسکو تسلیم کرتے تھے۔ ظہیر کا شعر ہے۔

کلاہ گوشۂ حکم تو از طریق نفاد　　　ربودہ از سر گردوں کلاہ جباری

ملک موصوف نے ربودہ کو فگندہ سے بدل دیا جس سے مصرع کی ترکیب چست ہوگئی۔ بخیل کی ہجو میں مشہور شعر ہے۔

ایں سہل بود کہ گو گرد سرخ خواست　　　گر نان خواجہ خواستی آں راچہ کردے

ملک صاحب نے یوں اصلاح دی۔

ایں سہل بود کہ آب حیات خواست　　　گر نان خواجہ خواستی آں راچہ کم

نان کے ساتھ آب حیات کے مقابلہ نے لطف پیدا کر دیا۔ ایک اور شعر تھا۔

گر مشک خواند خاک درت را فلک مرنج　　　نرخ گہر بہ طعن خریدار شکند

ملک موصوف نے پہلے مصرعہ کو یوں بدل دیا۔

گر سل خواند سنگ درت مشتری مریخ -

لیکن انصاف یہ ہے کہ امیر صاحب کی یادگار سے ہم اس سے زیادہ توقع رکھتے تھے - بدایونی نے ان اصلاحوں کو نقل کر کے سچ لکھا کہ ملک احمد چونکہ خسرو کی یادگار تھے اس لئے بادشاہ اور درباری اس کو بھی امیر کا تبرک سمجھتے تھے اور غنیمت جانتے تھے۔

امیر صاحب کی ایک صاحبزادی تھیں لیکن سخت افسوس ہے کہ اُس زمانہ میں عورتوں کی ایسی بے قدری تھی کہ امیر کو اُن کے پیدا ہونے کا رنج تھا۔ جب وہ سات برس کی ہوئیں تو امیر صاحب نے لیلیٰ مجنوں لکھی۔ اس میں صاحبزادی سے خطاب کرتے ہیں -

اے زعفت فگندہ بر رخ نور	ہم عفیفہ بنام دہم مستور
کاش مادر تو ہم بہ چہرہ نبودے	در رحم طفل ہشت مہ بودے
لیک چون زاد خدائے روا ست	با خدا داد گان ستیزہ خطا ست
من پذیرفتم انچہ یزداں داد	کانچہ او داد بازنتواں داد
پدرم ہم زمادر است آخر	مادرم نیز دختر است آخر

پہلے آرزو کی ہے کہ کاش تم پیدا نہ ہوتیں۔ یا ہوتیں تو بیٹی کے بجائے بیٹا ہوتیں۔ پھر طرح طرح کی تاویلوں سے دل کو تسلی دی ہے کہ خدا کے

دلے کو کون ٹال سکتا ہی۔ اور آخر میرا باپ بھی تو عورت سے پیدا ہوا۔ اور میری ماں بھی تو آخر عورت تھی۔

صاحبزادی کو جو نصیحتیں کی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں عورتوں کی حالت بہت پست تھی۔ امیر صاحب اس قدر صاحب دولت و ثروت تھے۔ لیکن بیٹی سے کہتے تھے کہ خبردار چرخہ کاتنا نہ چھوڑنا۔ اور کبھی موکھے سے پاس بیٹھ کر اِدھر اُدھر نہ جھانکنا۔

دوک و سوزن گذاشتن نہ فن است | کالتِ پردہ پوشی بدن است
پا بداماں عاقبت سرکن | رُو بدیوار و پشت بر در کن
در تماشائے روزنت ہوس است | روزنِ چشم سوزن تو بس است

امیر صاحب کو اپنی والدہ سے بے انتہا محبت تھی۔ بڑی عمر کو بھی پہونچکر وہ اس جوش محبت سے ماں سے ملتے تھے جس طرح چھوٹے بچے ماں سے لپٹ جاتے ہیں۔ اودھ کی معقول ملازمت صرف اِس بنا پر چھوڑ دی کہ ماں دلّی میں تھیں اور اُن کو یاد کیا کرتی تھیں۔ اودھ سے جب دلّی میں آئے ہیں تو ماں سے ملنے کا حال اِس جوش سے لکھا ہے کہ لفظ لفظ سے محبت کی شراب ٹپکتی ہے۔

ایک موقع پر جب ماں سے ملے ہیں اور ماں نے سینہ سے لگایا ہے تو ایک شعر بے اختیار زبان سے نکلا ہے۔ جسکا مطلب یہ ہے کہ ماں کا سینہ

بہشت ہی۔ چنانچہ دو نہریں دودھ کی اس میں جاری ہیں۔ ۶۹۸ھ میں انھوں نے انتقال کیا۔ اسی سال انکے چھوٹے بھائی حسام الدین نے بھی انتقال کیا۔ لیلیٰ مجنوں میں دونوں کا مرثیہ ایک ساتھ لکھا ہی۔

امسال دو نور ز اخترم رفت ‏— هم مادر و هم برادرم رفت
یک ہفتہ ز بخت خفتۂ من ‏— گم شد دو مہ دو ہفتۂ من
بخت از دو شکنجہ داد پیچم ‏— چرخ از دو طپانچہ کرد ہیچم
ماتم دو شد و غمم دو افتاد ‏— فریاد کہ ماتمم دو افتاد
حیف است دو داغ چون منے را ‏— یک شعلہ بس است خرمنے را
یک سینہ و دو بار برنگیرد ‏— یک سر دو خمار برنگیرد
چون مادر من بزیر خاک است ‏— گر خاک بسر کنم چہ باک است
اے مادر من کجائی آخر ‏— روے از چہ نمی نمائی آخر
خندان ز دل زمین بر دل آئے ‏— بر گریہ و زار ایم بخشائے
ہر جا کہ ز پاے تو غبار یست ‏— ما را ز بہشت یادگاریست
ذات تو کہ حفظ جان من بود ‏— پشت من و پشتبان من بود
روزے کہ لب تو در سخن بود ‏— پیوند تو صلاح کار من بود
امروز منم بہ مہر پیوند ‏— خاموشی تو ہمی دہد پند

فقر و تصوف | اڑتالیس برس کی عمر میں ان کو اس طرح یاد کرنے میں

جس طرح کمسن بچہ ماں کے لئے بلکتا ہے۔ اس سے آگے بھائی کے مرثیہ کے شعر ہیں اور وہ بھی خونِ جگر سے رنگین ہیں۔

امیر صاحب اگرچہ خاندان کے اثر سے شاہی دربار سے تعلق رکھتے تھے۔ اور اسی قسم کی زندگی بسر کرتے تھے جو عام دنیاداروں کا طریقہ ہے۔ لیکن یہ امر اُن کی اصل فطرت کے خلاف تھا۔ درباداری خوشامد اور شخص پرستی سے ان کو طبعی نفرت تھی اور موقع بموقع یہ خیالات بے اختیار ان کی زبان سے نکل جاتے تھے۔ لیلیٰ مجنوں ۶۹۸ھ میں لکھی تھی۔ جب ان کو سلطان علاء الدین خلجی جیسے جبار بادشاہ سے تعلق تھا تاہم خاتمہ میں لکھتے ہیں۔

شب تا سحر و ز صبح تا شام	در گوشۂ غم نگیرم آرام
باشم ز برائے نفس خود رائے	پیشش چو خوئے ستادہ بر پائے

اسپر مزید یہ ہوا کہ ان کے والد نے ان کو آٹھ برس کی عمر میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے قدموں پر ڈال دیا تھا اور برکت کے لئے بیعت کرا دی تھی۔ حضرت خواجہ کی روحانی تاثیر چپکے چپکے اپنا کام کرتی جاتی تھی۔ امیر صاحب کی طبیعت میں عشق و محبت کا مادہ بھی ازلی تھا۔ وہ سرتا پا عشق تھے۔ اور یہ بجلی ان کی رگ رگ میں کوندتی پھرتی تھی۔ آخر یہ نوبت پہنچی کہ ۷۱۲ھ میں جیسا کہ خود افضل الفوائد میں لکھا ہے خواجہ صاحب کے

ہاتھ پر دوبارہ بیعت کی۔ خواجہ صاحب نے چار گوشہ کی ٹوپی جو اس سلسلہ
کی نشانی تھی عنایت کی۔ اور مریدانِ خاص میں داخل کیا۔ قدرت اللہ
قدرت نے طبقات الشعرا میں لکھا ہے کہ امیر صاحب نے جب خواجہ صاحب سے
بیعت کی تو جو کچھ نقد اور اسباب تھا سب لٹا دیا اور بے دامن ہو کے بیٹھ گئے۔

خواجہ صاحب سے امیر صاحب کی ارادت اور عقیدت، عشق کے
درجہ تک پہونچ گئی تھی۔ ہر وقت ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ اور گویا اُن کا
جمال دیکھ کر جیتے تھے۔ خواجہ صاحب کو بھی ان کے ساتھ یہ تعلق تھا کہ فرمایا
کرتے تھے کہ جب قیامت میں سوال ہوگا کہ نظام الدین کیا لایا ہے تو خسرو
پیش کر دوں گا۔ دعا مانگتے تھے تو خسرو کی طرف اشارہ کر کے فرماتے تھے۔

الٰہی! بہ سوز سینۂ ایں ترک مرا بہ بخش۔

ایک دفعہ خواجہ صاحب لب دریا ایک کوٹھے پر بیٹھ کر ہندوؤں
کی عبادت اور اشنان کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ امیر خسرو صاحب بھی حاضر
تھے خواجہ صاحب نے فرمایا دیکھتے ہو! مصرع

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے

اس وقت خواجہ صاحب کی ٹوپی ذرا ٹیڑھی تھی امیر صاحب نے اُس کی
طرف اشارہ کر کے برجستہ کہا۔ مصرع

ما قبلہ راست کردیم بر طرف کجکلاہے۔

جہانگیر نے تزک جہانگیری میں لکھا ہی کہ میری مجلس میں قوال یہ شعر گا رہے تھے۔ میں نے اسکا شان نزول پوچھا۔ ملا علی احمد مہر کن نے واقعہ بیان کیا۔ مصرع آخر کے ختم ہوتے ہوتے ملا کی حالت بدلنی شروع ہوئی۔ یہانتک کہ غش کھا کر گرے دیکھا تو دم نہ تھا۔[1]

خواجہ صاحب نے امیر صاحب کو ترک اللہ کا خطاب دیا تھا اور اسی لقب سے پکارتے تھے۔ امیر صاحب نے جا بجا اسپر فخر کیا ہی۔ چنانچہ ایک قصیدہ میں جو خواجہ صاحب کی مدح میں ہی فرماتے ہیں۔

برزبانت چوں خطاب بندہ ترک اللہ رفت　　دست ترک اللہ گیر دہم بہ اللہش سپار

خواجہ صاحب نے وصیت کی تھی کہ خسرو کو میری قبر کے پہلو میں دفن کرنا یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ اگر ایک قبر میں دو لاشوں کا دفن کرنا جائز ہوتا تو میں اپنی ہی قبر میں ان کو بھی دفن کراتا۔

امیر صاحب نے تصوف میں جو مدارج حاصل کئے اُن کو نہ ہم جان سکتے ہیں اور نہ بیان کر سکتے ہیں۔ یہ البتہ نظر آتا ہی کہ امیر صاحب کا ہر شعر جو بجلیاں گراتا ہی وہ اُسی وادی ایمن کی شرر باریاں ہیں۔

امیر صاحب کی صوفیانہ زندگی کا ایک بڑا واقعہ حسن دہلوی کے تعلقات ہیں۔ حسن نہایت صاحب جمال تھے اور نان بائی کا پیشہ کرتے تھے

---

[1] تزک جہانگیری صفحہ ۱۔ مطبوعہ علیگڈھ۔

امیر صاحب کا عین شباب تھا کہ ایک دن اتفاق سے ان کی دوکان کے سامنے سے گزرے۔ آفتاب حسن کی شعاعیں ان پر بھی پڑیں۔ وہیں ٹھہر گئے اور پوچھا کہ کس حساب سے روٹی بیچتے ہو؟ حسن نے کہا کہ ایک پلڑے پر روٹی رکھتا ہوں اور خریدار سے کہتا ہوں کہ دوسرے میں سونا رکھے۔ سونے کا پلڑہ جھک جاتا ہے تو روٹی حوالہ کر دیتا ہوں۔ امیر نے کہا اور خریدار مفلس ہو؟ حسن نے کہا تو سونے کے بدلے درد اور نیاز لیتا ہوں۔ اس انداز گفتگو نے امیر صاحب کو اور بھی بے اختیار کر دیا۔ فوراً حضرت نظام الدین اولیا کی خدمت میں آئے اور واقعہ بیان کیا۔ حسن نے گو ناوک اندازی کی تھی لیکن خود بھی شکار ہو گئے۔ اسی وقت دوکان بند کر کے خواجہ صاحب کی خدمت میں پہونچے۔ اور اپنے دل دادہ (امیر خسرو) سے ملے۔ اسی تعلق سے خواجہ صاحب کی خدمت میں اکثر آتے جاتے رہتے تھے[۱]۔

---

[۱] یہ واقعہ اکثر تاریخوں اور تذکروں میں منقول ہے لیکن صاحب بہارستان سخن نے اس کی معقول بنا پر تکذیب کی ہے اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی یہ عبارت نقل کی ہے" بقیاس چناں در می آید کہ حسن را بسبب امیر خسرو گونہ تقدم باشد۔ چہ میر حسن را در مدح سلطان غیاث الدین بلبن قصائد غراست و در کلام امیر خسرو در مدح سلطان کمتر چیزے میتواں یافت"۔ ۱۲

امیر صاحب سے اسقدر تعلقات بڑھے کہ دونوں ایک دم کیلئے بھی جدا نہیں ہوتے تھے۔ امیر صاحب نے جب خان شہید کی ملازمت کی تو حسن بھی ساتھ ملازم ہوئے۔ چنانچہ جب ملتان میں خان شہید کو تاتاریوں نے ہلاک کیا تو امیر صاحب کے ساتھ حسن بھی اس موقع پر موجود تھے دونوں کے تعلقات کا چرچا زیادہ پھیلا تو لوگوں نے خان شہید سے شکایت کی امیر صاحب نے اس واقعہ پر یہ غزل لکھی۔

زیں دل خود کام کارمن برسوائی کشید ... خسروا فرمان دل بردن ہمیں بار آورد

خان شہید نے بدنامی کے خیال سے حسن کو امیر صاحب کے ملنے سے منع کردیا۔ لیکن کچھ اثر نہ ہوا۔ خان شہید نے غصہ میں آکر حسن کے ہاتھ پر کوڑے لگوائے۔ حسن سیدھے امیر صاحب کے پاس گئے۔ خان شہید کو اسی وقت پرچہ لگا۔ نہایت متحیر ہوا۔ اور امیر صاحب کو بلوا بھیجا۔ آئے تو کہا کیا حالت ہے؟ امیر نے آستین سے ہاتھ نکال کر دکھایا اور کہا۔ ع

گواہ عاشق صادق در آستیں باشد

دیکھا تو جہاں حسن کے کوڑے لگے تھے وہیں امیر صاحب کے ہاتھ پر بھی کوڑے کے نشان تھے[1]

---

[1] یہ تمام واقعات فرشتہ نے امیر خسرو کے تذکرہ میں لکھے ہیں۔ لیکن آخیر کا واقعہ آجکل کون تسلیم کرے گا؟!

چونکہ حسن کا تذکرہ ہم الگ نہیں لکھتے۔ اور صنف غزل پر ان کا خاص احسان ہے۔ اس لئے ان کے شیدائی۔ امیر صاحب ہی کے تذکرہ میں ان کے اشعار نقل کرتے ہیں۔

خلق گوئید۔ دل از صبر بجا آور باز ... ایدل۔ از صبر نشانے دہ اگر جائے ہست
اے کہ نظارۂ دیوانہ نہ کردی ہرگز ... قدمے رنجہ کن ایں سوئے کہ سودائے ہست

بر چوں تو۔ کسے دگر گزیدن ... کارے دگر ست۔ کار من نیست
گفتی کہ چرا۔ جدائی از من ... ایں از فلک است۔ از حسن نیست

باز ایں دلم بسوئے دلارام میرود ... از دام جستہ۔ باز سوئے دام میرود
ایام دینیا مدہ با ما بدوستی ... واں شوخ ہم بسیرت ایام میرود

اے خواجہ! در محلۂ تقویٰ قیام گیر ... در کوئے عاشقی نتواں نیکنام شد
عقلم کہ زیں بر ابلق ایام می نہاد ... آخر بتازیانۂ عشق تو رام شد

طرفہ سرد کارے است کہ با وعدۂ شوق ... صابر نتواں بود تقاضا نتواں کرد

از حسن ایں چہ سوال ست کہ معشوق تو کیست　　این سخن را چہ جواب است تو ہم میدانی

دو سہ بار۔ با تو گفتم کہ مرا بہیچ لبتاں　　نہ شد اتفاق۔ شاید کہ بہ این بہا گرانم

تلخ کردم جہانیاں را خواب　　زاں دعاہا کہ مستجاب نبود
اے حسن یار گر خطائے کرد　　ہم شکایت از در صواب نبود

بہ تقوائے نام نیکو بردہ بودم　　نکورویاں۔ مرا بدنام کردند

گفتی کہ چرا حال دل خویش نگوئی　　من خود کنم آغاز بہ پایاں کہ رساند؟

ان اشعار سے اندازہ ہو سکتا ہو کہ جو سوز و گداز۔ اور جذبہ و اثر ان کے کلام میں موجود ہو۔ انکے کشتۂ محبت (امیر صاحب) میں بھی نہیں۔

جامعیت کمالات ہندوستان میں چھ سو برس سے آجتک۔ اس درجہ کا جامع کمالات نہیں پیدا ہوا۔ اور سچ پوچھو تو اس قدر مختلف اور گوناگون اوصاف کے جامع۔ ایران و روم کی خاک نے بھی ہزاروں برس کی مدت میں دو ہی چار پیدا کئے ہوں گے۔ صرف ایک شاعری کو لو تو ان کی جامعیت پر حیرت ہوتی ہو

فردوسی ۔ سعدی ۔ انوری ۔ حافظ ۔ عرفی ۔ نظیری بے شبہ اقلیم سخن کے جم د کے ہیں ۔ لیکن اُن کی حدود حکومت ۔ ایک اقلیم سے آگے نہیں بڑھتی ۔ فردوسی مثنوی سے آگے نہیں بڑھ سکتا ۔ سعدی قصیدہ کو ہاتھ نہیں لگا سکتے ۔ انوری مثنوی اور غزل کو چھو نہیں سکتا ۔ حافظ ۔ عرفی ۔ نظیری غزل کے دائرہ سے باہر نہیں نکل سکتے ۔ لیکن امیر صاحب کی جہانگیری میں غزل مثنوی ۔ قصیدہ ۔ رباعی ۔ سب کچھ داخل ہے ۔ اور چھوٹے چھوٹے خطہ ہائے سخن یعنی نظمیں ۔ مستزاد اور صنائع و بدائع کا تو شمار نہیں ۔ تعداد کے لحاظ سے دیکھو تو اس خصوصیت میں کسی کو ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں ہو سکتا ۔ فردوسی کے اشعار کی تعداد کم و بیش ستر ہزار ہے ۔ صائب نے ایک لاکھ شعر سے زیادہ کہے ہیں ۔ لیکن امیر صاحب کا کلام کئی لاکھ سے کم نہیں ۔ اکثر تذکروں میں خود امیر صاحب کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ان کا کلام تین لاکھ سے زیادہ اور چار لاکھ سے کم ہے ۔ لیکن اس میں غالباً ایک غلط فہمی ہے ۔ امیر صاحب نے ابیات کا لفظ لکھا ہے اور قدما کے محاورہ میں بیت ایک سطر کو کہتے ہیں ۔ چنانچہ نثر کی کتابوں کے متعلق یہ تصریحیں جا بجا نظر آتی ہیں کہ اس میں اس قدر بیتیں ہیں ۔

ان سب پر مستزاد یہ کہ اوحدی نے تذکرۂ عرفات میں لکھا ہے کہ امیر صاحب کا کلام جس قدر فارسی میں ہے اُسی قدر برج بھاکا میں ہے ۔ کس قدر

افسوس ہی کہ اس مجموعہ کا آج نام و نشان بھی نہیں۔
مختلف زبانوں کی زباں دانی کا یہ حال ہی کہ ترکی اور فارسی اصلی زبان ہی عربی میں ادباے عرب کے ہمسر ہیں، سنسکرت کے ماہر ہیں چنانچہ مثنوی نہ سپہر میں تواضع کے لہجہ میں اسکا ذکر کیا ہی۔

من قدیسے بر سر ایں کار شدم

شاعری کے بعد نثاری کا نمبر ہے۔ اُس وقت تک کسی نے نثر لکھنے کے اصول اور قاعدے نہیں مرتب کئے تھے۔ انھوں نے ایک مستقل کتاب اعجاز خسروی تین جلدوں میں لکھی۔ اور اگرچہ افسوس ہے کہ زیادہ تر زور صنائع و بدائع پر صرف کر گیا۔ لیکن ان کی طباعی اور ذہانت سے کون انکار کر سکتا ہے۔

موسیقی میں یہ کمال پیدا کیا کہ نایک کا خطاب۔ ان کے بعد آج تک پھر کوئی شخص حاصل نہ کر سکا۔ چنانچہ اس کی تفصیل مستقل عنوان میں آئی ہی
ان مختلف الحیثیات مشغلوں کے ساتھ فقر و تصوف کا یہ رنگ ہی کہ گویا عالم قدس کے سوا دنیاے فانی کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھا چنانچہ اسکا ذکر بھی الگ عنوان میں آئے گا۔

ان سب باتوں کے ساتھ جب یہ نظر کی جاتی ہے کہ ان کاموں میں مشغول ہونے کے لئے وقت کس قدر ملتا تھا۔ تو سخت حیرت ہوتی ہے۔

وہ ابتدا سے ملازمت پیشہ تھے اور درباریوں میں تمام دن حاضری دینی
تھی۔ کام جو سپرد تھا۔ وہ شاعری نہ تھی۔ بلکہ اور اشغال تھے۔ لیے
مجنوں کے خاتمہ میں لکھتے ہیں۔

مسکین من مستمند مدہوش | از سوختگی چو دیگ پُر جوش
شب تا سحر و ز صبح تا شام | در گوشہ غم نگیرم آرام
باشم ز برائے نفس خود را | پیش چو خودے ستادہ بر پا

یعنی نفس پروری کیوجہ سے اپنے ہی جیسے کے آگے صبح سے شام تک مؤدب کھڑا رہتا ہوں

تا خوں نہ رود ز پائے تا سر | دستم نہ شود ز آب کس تر

جب تک پانوں کا پسینہ سر تک نہیں پہنچتا۔ کھانا کھانیکو نہیں ملتا

ان حالات کے ساتھ اگر صانع قدرت اُن کے پیدا کرنے پر ناز کرے
تو چنداں ناموزوں نہ ہوگا۔

کمال موسیقی

امیر صاحب کی ہمہ گیر طبیعت نے اس نازک اد
لطیف فن پر بھی توجہ کی اور اس درجہ تک پہنچایا ک
کہ چھ سو برس کی وسیع مدت نے بھی ان کا جواب پیدا نہ کیا۔ ان کے زما
کا مشہور جگت استاد جو تمام ہندوستان کا استاد تھا نایک گوپال تھا۔
اس کے بارہ سو شاگرد تھے جو اس کے سنگھاسن یعنی تخت کو کہاروں
کی طرح اٹھا کر لے چلتے تھے۔ سلطان علاء الدین خلجی نے اس کے کمال ک

شہرہ سنا تو دربار میں بلایا۔ امیر صاحب نے عرض کی کہ میں تخت کے نیچے چھپ کر بیٹھتا ہوں۔ نایک گوپال سے گانے کی فرمایش کی جائے۔ نایک نے چھ مختلف جلسوں میں اپنا کمال دکھایا۔ ساتویں دفعہ امیر صاحب بھی اپنے شاگردوں کو لیکر دربار میں آئے۔ گوپال بھی ان کا شہرہ سن چکا تھا۔ ان سے گانے کی فرمائش کی۔ امیر صاحب نے کہا مغل ہوں۔ ہندوستانی گانا یوں ہی سا جانتا ہوں۔ پہلے آپ کچھ سنائیں تو میں بھی کچھ عرض کروں گا۔

گوپال نے گانا شروع کیا۔ امیر صاحب نے کہا یہ راگ تو مدت ہوئی میں باندھ چکا ہوں۔ پھر خود اسکو ادا کیا۔ گوپال نے دوسرا راگ شروع کیا۔ امیر صاحب نے اسکو بھی ادا کر کے بتایا کہ مدتوں پہلے میں اسکو ادا کر چکا ہوں غرض گوپال جو راگ راگنی اور سُر ادا کرتا تھا امیر صاحب اسکو اپنا ایجاد ثابت کر جاتے تھے۔ بالآخر کہا کہ یہ تو عام بازاری راگ تھے۔ اب میں اپنے خاص ایجادات سناتا ہوں۔ پھر جو گانا شروع کیا تو گوپال مبہوت ہو کر رہ گیا[1]

---

[1] عالمگیری عہد میں فقیر اللہ خطاب سیف خاں تھا۔ ایک مشہور امیر تھا۔ ناصر علی سرہندی کی شان میں کہا ہے (گفتگوے طوطی از آئینہ می خیزد علی + گر نباشد سیف خاں بار النفس در کار نیست۔ وہ موسیقی کا بڑا ماہر تھا۔ فن موسیقی کی ایک مستند کتاب[2] تک سومل تھی فقیر اللہ نے اسکا فارسی میں ترجمہ کیا اور بہت سے زوائد اضافہ کیے اور اسکا نام راگ درپن رکھا چنانچہ مآثر الامرا جلد دوم صفحہ ۹۰۴ مطبوعہ کلکتہ میں مفصل مذکور ہے۔ اس کتاب کا ایک قدیم نسخہ میرے پاس ہے اور ایک نسخہ ندوہ کے کتبخانہ میں ہے گوپال کا واقعہ اور آئندہ امیر خسرو کی ایجادات میں نے اسی نسخہ سے لیے ہیں ۱۲۔

امیر صاحب چونکہ ہندی کے ساتھ فارسی راگوں سے بھی واقف تھے
اس لئے انھوں نے دونوں موسیقی کو ترکیب دے کر ایک نیا علم پیدا کر دیا۔
چنانچہ ان کے ایجاد کردہ راگ حسب ذیل ہیں[1]۔

نام راگہائے مخترعہ امیر خسرو — کن راگوں سے مرکب ہے

بھیرا — غار اور ایک فارسی راگ سے مرکب ہے،
ساز گری، — پوربی۔ گورا، کنگلی۔ ایک فارسی راگ قران السعدین
میں اسکا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں
شعر: زمزمۂ ساز گری در عراق — کردہ بہ گلبانگ عراق اتفاق
ایمن — ہنڈول اور نیریز۔
عشاق — سارنگ اور بسنت اور نوا۔
موافق — ٹوڑی و مالری و دوگاہ و حسینی،
غنم — پوربی میں ذرا تغیر کر دیا ہے۔
زلیف — کھٹ راگ میں شہناز کو ملایا ہے۔
فرغنہ — کنگلی اور گورا میں فرغانہ ملایا ہے۔

---

[1] راگ درپن کے دو نسخہ جو میرے استعمال میں ہیں دونوں غلط ہیں اسلئے راگوں کے
نام صحیح نہیں پڑھے گئے۔ اس لئے کہیں کہیں میں نے صرف صورت نویسی کر دی ہے ۱۲۔

سرپردہ — سازگر. بلاول. اور راست کو ترکیب دیا ہے۔

باخرز — دیسکار میں ایک فارسی راگ ملا دیا ہے۔

فرزدست (یا) پھردوست — کانہڑا۔ گوری۔ پوربی اور ایک فارسی راگ سے مرکب ہے۔

منم — کلیان میں ایک فارسی راگ شامل کیا ہے۔

راگ درپن میں لکھا ہے کہ ان راگوں میں سازگری۔ باخرز۔ عشاق اور موافق میں موسیقی کا کمال دکھایا ہے۔ باقی راگوں میں کچھ لوٹ پھیر اور بدل کرکے دوسرا نام رکھدیا ہے۔ قول۔ ترانہ۔ خیال۔ نقش۔ نگار۔ بسیط۔ تالانہ۔ سوہلہ۔ یہ سب بھی امیر صاحب کی ایجاد ہیں۔ ان میں سے بعض خاص ان کی ایجاد ہیں۔ بعض کے نام ہندی میں پہلے موجود تھے۔ امیر صاحب نے ان میں کچھ تصرف کرکے نام بدل دیا۔

تصانیف جامی نے نفحات الانس میں لکھا ہے کہ امیر صاحب نے ۹۲ کتابیں تصنیف کیں۔ یہ بھی مشہور ہے کہ امیر صاحب نے خود کسی کتاب میں تصریح کی ہے کہ میرے اشعار پانچ لاکھ سے کم اور چار لاکھ سے زیادہ ہیں۔

امیر صاحب کی کثرت تصنیف سے کس کو انکار ہو سکتا ہے؟ لیکن بیانات مذکورۂ بالا مبالغہ سے خالی نہیں۔ چار پانچ لاکھ اشعار کی یہ

کیفیت ہے کہ قدیم زمانہ میں سطر کو بیت کہتے تھے۔ اور یہ استعمال نہایت کثرت سے مروج ہے۔ اس بنا پر ان کی ہر قسم کی تصانیف کی ۴-۵ لاکھ سطریں ہوں، تو چنداں تعجب نہیں۔ لوگوں نے بیت اور شعر کو مرادف سمجھ کر بیت کی جگہ شعر لکھدیا۔ ہندی کلام مدون نہیں ہوا۔ اس لئے مبالغہ کے لئے کافی موقع ہے۔ بہر حال جس قدر تصنیفات آج ملتی ہیں وہ بھی کم نہیں۔ اُن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

دیوان تحفۃ الصغر[1] — اسکے دیباچہ میں خود لکھتے ہیں کہ یہ سب سے پہلا دیوان ہے جس میں ۱۶ برس کی عمر سے ۱۹ برس تک کا کلام ہے۔

دیوان وسط الحیات — اس میں ۲۰ برس کی عمر سے ۳۳ یا ۳۴ برس تک کا کلام ہے۔ اس میں جو قصائد ہیں سلطان شہید تغلق خاں وغیرہ کی مدح میں ہیں۔

---

[1] امیر صاحب نے اپنے چاروں دیوانوں کے دیباچوں میں تصنیف کے متعلق کچھ کچھ حالات بھی لکھے ہیں تحفۃ الصغر اور غرۃ الکمال کا دیباچہ اسوقت میرے پیش نظر ہے اور دیوانوں کے دیباچہ بھی نظر سے گذرے ہیں لیکن اسوقت سامنے نہیں اسلئے ان کی نسبت میں جو کچھ لکھتا ہوں وہ ڈاکٹر ریو آر۔ سائی۔ ای۔ دی ہے کہ اس ریو سے ماخوذ ہے جو انھوں نے برٹش میوزیم کے کتب خانے کی فہرست میں لکھے ہیں۔ اس اطلاع کے متعلق میں مولوی عبدالقادر پروفیسر ... کا ممنون ہوا۔

غرۃ الکمال
یہ دیوان اپنے بھائی علاء الدین علی خطاط کے
اصرار سے مرتب کیا۔ ۳۴ برس کی عمر یعنے
۶۸۵ھ سے تقریباً ۶۹۵ھ تک کا کلام ہے
دیباچہ میں اپنی مختصر سی سوانح عمری لکھی ہے۔
سلطان معز الدین کیقباد اور جلال الدین خلجی
کے مدحیہ قصائد ہیں۔ دو ہفتہ میں اس کی
ترتیب دی اور دیباچہ لکھا۔

بقیہ نقیہ
بڑھاپے کا کلام ہے۔ تاریخ تالیف مذکور نہیں۔
لیکن سلطان علاء الدین خلجی کا مرثیہ اس میں
موجود ہے اس لئے کم از کم ۷۱۵ھ کے بعد
تک کا کلام ہے۔

نہایۃ الکمال
پانچواں دیوان ہے۔ اس میں غزلوں کے
علاوہ قطب الدین مبارک خلجی المتوفی ۷۲۰ھ
کا مرثیہ اور اس کے ولیعہد کی مدحیں ہیں۔
ایک قصیدہ میں ۷۲۵ھ کا ایک واقعہ مذکور
ہے اور اسی سن میں جناب امیر خسرو نے
انتقال کیا ہے۔

کیفیت ہے کہ قدیم زمانہ میں سطر کو بیت کہتے تھے۔ اور یہ استعمال نہایت کثرت سے مروج ہے۔ اس بنا پر ان کی ہر قسم کی تصانیف کی ۴-۵ لاکھ سطریں ہوں۔ تو چنداں تعجب نہیں۔ لوگوں نے بیت اور شعر کو مرادف سمجھ کر بیت کی جگہ شعر لکھدیا۔ ہندی کلام مدوں نہیں ہوا۔ اس لئے مبالغہ کے لئے کافی موقع ہے۔ بہر حال جس قدر تصنیفات آج ملتی ہیں وہ بھی کم نہیں۔ اُن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

دیوان تحفۃ الصغر[1] اسکے دیباچہ میں خود لکھتے ہیں کہ یہ سب سے پہلا دیوان ہے جس میں ۱۶ برس کی عمر سے ۱۹ برس تک کا کلام ہے۔

دیوان وسط الحیات اس میں ۲۰ برس کی عمر سے ۳۳ یا ۳۴ برس تک کا کلام ہے۔ اس میں جو قصائد ہیں سلطان شہید تغلق خاں وغیرہ کی مدح میں ہیں۔

---

[1] امیر صاحب نے اپنے چاروں دیوانوں کے دیباچوں میں تصنیف کے متعلق کچھ کچھ حالات بھی لکھے ہیں تحفۃ الصغر اور غرۃ الکمال کا دیباچہ اسوقت میرے پیش نظر ہے اور دیوانوں کے دیباچہ بھی نظر سے گذرے ہیں لیکن اسوقت سامنے نہیں اسلئے ان کی نسبت میں جو کچھ لکھتا ہوں وہ ڈاکٹر ریو آر۔ آئی۔ ای۔ ڈی کے اس ریویو سے ماخوذ ہے جو انھوں نے برٹش میوزیم کے کتبخانے کی فہرست میں لکھے ہیں۔ اس اطلاع کے متعلق میں مولوی عبدالقادر پروفیسر [illegible] کا ممنون ہوا۔

غرۃ الکمال

یہ دیوان اپنے بھائی علاء الدین علی خطاط کے اصرار سے مرتب کیا۔ ۳۴ برس کی عمر یعنے ۶۸۵ھ سے تقریباً ۶۹۵ھ تک کا کلام ہے دیباچہ میں اپنی مختصر سی سوانح عمری لکھی ہے۔ سلطان معز الدین کیقباد اور جلال الدین خلجی کے مدحیہ قصائد ہیں۔ دو ہفتہ میں اس کی ترتیب دی اور دیباچہ لکھا۔

بقیہ نقیہ

بڑھاپے کا کلام ہے۔ تاریخ تالیف مذکور نہیں۔ لیکن سلطان علاء الدین خلجی کا مرثیہ اس میں موجود ہے اس لئے کم از کم ۷۱۵ھ کے بعد تک کا کلام ہے۔

نہایۃ الکمال

پانچواں دیوان ہے۔ اس میں غزلوں کے علاوہ قطب الدین مبارک خلجی المتوفی ۷۲۰ھ کا مرثیہ اور اس کے ولیعہد کی مدحیں ہیں۔ ایک قصیدہ میں ۷۲۵ھ کا ایک واقعہ مذکور ہے اور اسی سن میں جناب امیر خسرو نے انتقال کیا ہے۔

قران السعدین — سب سے پہلی مثنوی ہے ۶۸۸ھ میں جب کہ مصنف کی عمر ۳۶ برس کی تھی لکھی۔ کیقباد اور بغرا خاں کے مراسلات اور صلح و ملاقات کا کا حال ہے۔

مطلع الانوار — مخزن الاسرار کا جواب ہے سلطان علاءالدین خلجی کے نام پر لکھی۔ ۳۳۱۰ شعر ہیں۔ دو ہفتہ میں تمام ہوئی۔ سال اختتام ۶۹۸ھ ہے تصوف کے مضامین ہیں اور پنج گنج کے سلسلہ کی پہلی کتاب ہے۔

شیریں خسرو — رجب ۶۹۸ھ میں تمام ہوئی۔ ۴۱۲۴ شعر ہیں سکندر نامہ کا جواب ہے۔ سال اختتام ۶۹۹ھ ہے۔ اشعار کی تعداد ۴۴۰۵۔

لیلیٰ مجنوں — ۲۶۶۰ شعر ہیں ۶۹۸ھ میں ختم ہوئی۔

ہشت بہشت — سلسلۂ پنج گنج کی سب سے اخیر مثنوی ہے۔ ہفت پیکر نظامی کا جواب ہے ۷۰۱ھ میں تمام ہوئی ۳۳۵۲ شعر ہیں۔

پورا خمسہ سلطان علاءالدین خلجی کے نام پر ہے

کُل ۱۸ ہزار شعر ہیں۔ خمسۂ نظامی میں ۲۸ ہزار شعر ہیں۔ پانچوں کتابیں دو برس کی مدت میں تمام ہوئیں۔

تاج الفتوح

سلطان جلال الدین فیروز شاہ کی تخت نشینی کے سال اول یعنی ۶۸۹ھ سے جمادی الآخر ۶۹۰ھ تک کے حالات ہیں۔ اور اسی سنہ میں یہ مثنوی تمام بھی ہوئی۔ مطلع یہ ہے۔

سخن بر نام شاہے کردم آغاز

نہ سپہر

قطب الدین خلجی کے نام پر ہے۔ نو باب ہیں اور ہر باب جداگانہ بحر میں ہے اس مناسبت سے نو سپہر نام رکھا ہے۔ اس وقت امیر خسرو کی عمر ۶۵ برس کی ہو چکی تھی۔ ۷۱۸ھ میں تمام ہوئی۔

دول رانی وخضر خاں

دول رانی۔ گجرات کے راجہ کی لڑکی تھی۔ خضر خاں سلطان علاء الدین کا بیٹا تھا۔ وہ دیول رانی پر عاشق ہو گیا تھا اور اس سے شادی کی خضر خاں نے خود یہ حالات بطور یادداشت کے

لکھے تھے۔ اِس کی فرمایش سے امیر صاحب نے
اس کو نظم کا لباس پہنایا اور عشقیہ نام رکھا چار
مہینے میں تمام ہوئی۔ ۴۲۰۰ شعر تھے۔ خضر خاں
کے مرنے پر دول رانی کو جو واقعات پیش آئے
ان کو لکھا تو ۳۱۹ شعروں کا اضافہ ہوا ۷۱۵ھ میں تمام ہوئی۔

افضل الفوائد — خواجہ نظام الدین اولیا کے ملفوظات ہیں۔

اعجاز خسروی — نثر نویسی کے اصول اور قواعد منضبط کئے ہیں
اور سینکڑوں صنعتیں اختراع کی ہیں ۷۱۹ھ
میں تمام ہوئی۔ تین جلدوں میں ہے۔

تغلق نامہ — غیاث الدین تغلق کے حالات اور فتوحات ہیں

خزائن الفتوح — سلطان علاء الدین کے فتوحات ہیں۔

مناقب ہند — تاریخ ہند

اِن کتابوں کا ذکر دولت شاہ نے کیا ہے۔ دولت شاہ نے
لکھا ہے کہ اِن تصنیفات کے علاوہ فن حساب۔ اور فن موسیقی میں بھی
ان کی تصنیفیں ہیں۔

شاعری — امیر صاحب اگرچہ ہندی نژاد تھے۔ لیکن ایرانی شعرا کو بھی
ان کی شاعری اور زبان دانی کا اعتراف کرنا پڑا۔ جامی

بہارستان میں لکھتے ہیں کہ خمسہ نظامی کا جواب خسرو سے بہتر کسی نے نہیں لکھا
طوطی ہند جو ان کا خطاب تھا۔ ایرانی بھی اسی خطاب سے اُن کو یاد کرتے ہیں۔

عرفی

بروح خسرو ازیں پارسی شکر دارم | کہ کام طوطیِ ہندوستاں شود شیریں

خواجہ حافظ

شکر شکن شوند ہمہ طوطیانِ ہند | زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

آذری نے جواہر الاسرار میں لکھا ہے کہ شیخ سعدی شیرازی خسرو سے ملنے کے لئے شیراز سے دہلی میں آئے۔ اگرچہ یہ روایت قرین قیاس نہیں۔ اور بعض تذکرہ نویسوں نے صراحتًہ اس واقعہ سے انکار کیا ہے۔ تاہم اس سے اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ آذری کے نزدیک خسرو اس پایہ کے شخص تھے کہ سعدی کا ان کی ملاقات کے لئے سفر کرنا ممکن تھا۔ اور اس قدر تو تمام تذکرہ نویسوں کو تسلیم ہے کہ جب سلطان شہید نے سعدی کو شیراز سے بلایا تو انھوں نے بڑھاپے کا عذر کیا اور لکھ بھیجا کہ خسرو جوہر قابل ہیں ان کی تربیت کی جائے۔ اسوقت ان کی عمر ۳۲ برس سے زائد نہ تھی

تاہم بعض بعض ایرانی شعرا قومی تعصب کو چھپا نہیں سکے۔ عبید ایک شاعر جو امیر کا معاصر ہے کہتا ہے۔

غلط افتاد خسرو را ز خامی | کہ سکبا پخت در دیگِ نظامی

امیر صاحب کی شاعری قدرتی تھی۔ وہ ماں کے پیٹ سے شاعر پیدا ہوے تھے۔ اُن کے باپ دادا شاعری سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھتے تھے بلکہ قلم کے بجائے تیغ سے کام لیتے تھے۔ تاہم امیر کے دودھ کے دانت بھی نہیں ٹوٹے تھے کہ اُن کی زبان سے بے اختیار شعر نکلتے تھے۔ دیباچۂ غرۃ الکمال میں خود لکھتے ہیں۔

"دراں صغر سن کہ دنداں می اُفتاد سخن می گفتم و گوہر از دہانم می ریخت"

دیوان تحفۃ الصغر کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

"چوں مرا اُستادے سر آمدہ بر سر نیامدہ بود کہ بر سر دقائق دال شدے

د آہوے خشکبار قلم را از سواد خطا باز آوردے"

ایک مدت تک یوں ہی بطور خود کہتے رہے۔ اُستاد کے بجائے اساتذہ کے دیوان کو سامنے رکھکر ان کا تتبع کرتے تھے۔ جس دیوان کا مطالعہ کرتے تھے اسی انداز پر کہنا شروع کرتے۔ خاقانی کا کلام دیکھا تو بہت مغلق نظر آیا۔ اُس کے الفاظ حل کئے۔ لیکن خود تحفۃ الصغر میں لکھتے ہیں کہ اس کا تتبع نہ ہو سکا۔ پہلا دیوان بالکل بے اصلاحی ہی۔ امیر صاحب اسکو مرتب کرنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ لیکن بھائی کی خاطر سے مجبور ہو گئے۔

لیکن بالآخر وہ اپنا کلام اساتذہ کو دکھلانے لگے ہشت بہشت کے خاتمہ میں تصریح کی ہی کہ یہ کتاب شہاب کی اصلاح یافتہ ہی۔ شہاب کی

پہلے نہایت تعریف کی ہے۔ پھر لکھتے ہیں۔

من بہ عرضہ کردہ نامۂ خویش	او باصلاح راند خامۂ خویش
دید ہر نکتہ زار رقم بہ رقم	رنج بر خود نہاد و منت ہم
نظرے تیز کرد موے شگاف	نے بہ عمیا لطائف بگذاف
این دقائق کہ شد ز مغز تش پوست	مو بمو شعر بیز کردۂ اوست
شمع من یافتہ ضیا از وے	مس من گشتہ کیمیا از وے
ہر چہ او گفت من نہادم گوش	بر کشیدم مگس ز شربت نوش
وانچہ بنمود من نہ جستم پے	عیب آن بر من ست نہ بر وے
یا رب او چون بہ رنج نامۂ من	بُرد میر دل خطائے خامۂ من
نامۂ او کہ حرز جانش باد	در قیامت خط امانش باد

اخیر کے شعروں سے معلوم ہوتا ہے کہ پانچوں مثنویاں شہاب کی اصلاح دادہ ہیں یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ امیر صاحب نرے مقلد نہ تھے جہاں اُن کو اصلاح کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی وہاں اُستاد کی رائے تسلیم نہیں کرتے تھے۔ گو ادب کا پاس اب بھی ملحوظ رکھتے تھے۔ ۶

عیب آں بر من ست نہ بر وے

کیا عجیب بات ہے۔ وہ اُستاد جسکے دامن تربیت میں آپ جیسا شخص پلکر بڑا ہوا۔ آج اُسکا نام و نشان تک معلوم نہیں۔

معاصر استادوں کے علاوہ امیر صاحب نے قدیم اساتذہ سے بھی بہت فیض حاصل کیا ہے وہ اُن کے کلام کو سامنے رکھ کر کہتے تھے۔ اور اسی طرح اُس سے فائدہ اُٹھاتے تھے جس طرح کوئی شاگرد زندہ استاد سے شاعری سیکھتا ہو۔ اسی بنا پر لیلیٰ مجنوں میں نظامی کی نسبت لکھتے ہیں:۔

زندہ است بمعنی اُستادم　　　　درنیست منش حیات دادم

شیخ سعدی سے استفادہ کا اشارہ کرتے ہیں۔

خسرو سرمست اندر ساغر معنی بریخت　　　　شیرہ از خمخانۂ مستی کہ در شیراز بود

تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ امیر صاحب جوانی کے جوش میں اکثر اساتذہ کی شان میں گستاخی کرتے تھے۔ چنانچہ جب مطلع الانوار لکھتے ہوئے یہ شعر کہا

کوکبۂ خسرویم شد بلند　　　　زلزلہ در گور نظامی فگند

تو غیب سے ایک تلوار نکلی اور خسرو کی طرف بڑھی۔ خسرو نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کا نام لیا۔ دفعتہً ایک ہاتھ نمودار ہوا اور اس نے آستین تلوار کے سامنے کر دی۔ تلوار آستین کو کاٹتی ہوئی ایک بیری کے درخت پر جا لگی۔ واللہ اعلم[۱]۔

خسرو نے مطلع الانوار ۶۹۸ھ میں لکھی ہے۔ اس وقت اُن کی عمر

---

[۱] یہ واقعہ جس قدر عقل کے خلاف ہو اُسی قدر تاریخ کے بھی خلاف ہے ۱۲

۴۰ برس کی ہو چکی تھی۔ یہ شباب کا زمانہ کہاں ہے۔ شباب کے زمانہ میں انھوں نے غرۃ الکمال مرتب کیا ہے اس کے دیباچہ میں صاف لکھتے ہیں کہ میں مثنوی میں نظامی کا پیرو اور شاگرد ہوں۔

اسی زمانہ میں قران السعدین لکھی اس میں لکھتے ہیں۔

نظم نظامی بہ لطافت چو دُر — وز دُر او سر بسر آفاق پُر
پختہ از دشد چو معانی تمام — خام بود پختن سودائے خام
بگذر ازیں خانہ کہ جائے تو نیست — دیں رہ باریک بپائے تو نیست
کالبدے داری وجاں اندروست — ہر چہ نودانی بہ ازاں اندروست
تا بود ایں سکہ بعالم درست — بر تن تو کے بود ایں شقہ چست
مثنوی او راست ثنائے بگوے — بشنوش از دردِ دعائے بگوے
ایں ہمہ زانصاف نگر ز درست — گر تو نہ بینی دگرے کو ز نیست

نظامی کی نسبت لیلیٰ مجنوں میں لکھتے ہیں۔

زندہ است بمعنے اوستادم — در نیست نفش حیات دادم

غرض امیر صاحب نے کبھی اساتذہ کی اُستادی سے انکار نہیں کیا۔ وہ تمام استادوں کا نہایت ادب کرتے تھے مطلع الانوار میں جو کہہ دیا ہے وہ ایک اتفاقیہ فخریہ جوش تھا جس سے نظامی کی تحقیر منظور نہ تھی۔

خود اپنی شاعری کی نسبت اظہار رائے

امیر صاحب کے حالات شاعری میں یہ سبب ہے

عجیب تر واقعہ ہے کہ وہ اپنے کلام پر آپ ریویو کرتے ہیں۔ اور ایسی بے لاگ رائے دیتے ہیں کہ اُن کا دشمن سے دشمن بھی ایسی آزاد رائے نہیں دے سکتا۔ قرآن السعدین میں اُنھوں نے کیقباد اور بغرا خاں کا حال لکھا ہے۔ لیکن اصلی واقعہ کو چھوڑ کر خاص خاص چیزوں کی تعریف میں اس قدر مصروف ہو جاتے ہیں کہ واقعات کا سلسلہ بالکل ٹوٹ جاتا ہے اور کلام نہایت بے ربط ہو جاتا ہے۔ اس عیب کو خود ظاہر کرتے ہیں۔

وصف بران گونہ فرو راندہ ام	کز غرض قصہ نز د ماندہ ام
عیب چناں نیست کہ بنہفتہ ام	کانچہ بگویند ہمہ گفتہ ام
چوں منم اندر قلبکان خویش	معترف عجز بہ نقصان خویش
عیب کسے نیست کہ جویند باز	چوں ہمہ عیب است چگویند باز

غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ شاعر کی تین قسمیں ہیں، استاد تمام جو کسی طرز خاص کا موجد ہو جیسے حکیم سنائی۔ انوری۔ ظہیر۔ نظامی۔ اُستاد نیم تمام خود کسی طرز خاص کا موجد نہیں، لیکن کسی خاص طرز کا پیرو ہے اور اُس میں کمال بہم پہنچایا ہے۔ سارق۔ جو اوروں کے مضامین چُراتا ہے۔ پھر لکھتے ہیں کہ اُستادی کی چار شرطیں ہیں۔ طرز خاص کا موجد ہو۔

اس کا کلام شعراء کے انداز پر ہو صوفیوں اور واعظوں کے طریقہ پر نہ ہو غلطیاں اور لغزشیں نہ کرتا ہو۔

یہ شرائط لکھ کر فرماتے ہیں کہ میں درحقیقت اُستاد نہیں۔ اس لئے کہ چار شرطوں میں سے مجھ میں صرف دو شرطیں پائی جاتی ہیں۔ یعنی میں سرقہ نہیں کرتا۔ اور میرا کلام صوفیوں اور واعظوں کے انداز پر نہیں لیکن دو شرطیں مجھ میں موجود نہیں اول تو میں کسی طرز خاص کا موجد نہیں۔ دوسرے میرا کلام لغزشوں سے خالی نہیں ہوتا۔ خود انکے الفاظ یہ ہیں۔

بندہ را ازاں چہار شرط اُستادی کہ گفتہ شد۔ اول شرطے کہ ملک طرز ست بر حکم ما جرائے کہ در مجرائے قلم جریاں یافت کہ چندیں استادر را متابع کلمات بودہ ام۔

چوں بس رو طرز ہر سوادم ۔۔۔ پس شاگردم نہ اوستادم

د شرط دوم آں کہ در نامۂ سواد بوسے خطا نا شنیدہ ازاں نیز دم نتوانم زد کہ نظم بندہ اگرچہ بیشتر رداں است۔ اما جابجا در غزل ڈمغز لغزیدنی ہم ست در سیوم و شرط معترفم کہ از لاف اُستادی فرعہ بر فال نتوانم غلطانید۔

کیا دنیا میں اس سے زیادہ کوئی انصاف پرستی اور بے نفسی کی مثال مل سکتی ہے۔ امیر صاحب کے کلام پر ریویو کرنے کے لئے اس سے زیادہ بڑھکر کیا دلیل راہ ہو سکتا ہے۔

امیر صاحب نے یہ بتا دیا ہے کہ وہ اصنافِ سخن میں سے کس صنف میں کس کے پیرو ہیں۔ تفصیل اس کی یہ ہے۔

غزل۔	سعدی	مثنوی۔۔	نظامی
مواعظ و حکم	سنائی و خاقانی	قصائد۔ رضی الدین نیشاپوری و کمال الدین اسمٰعیل خان المعانی	

لیکن لغزشیں کون بتائے؟ یہ کس کا منہ ہے۔ ہم دبی زبان سے صرف اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ بعض کلام میں "قران السعدین و اعجاز خسروی" لفظی رعایت بہت ہے جو ضلع جگت کی حد تک پہونچ گئی اور بعض جگہ بالکل تکلف اور آورد ہے۔

امیر صاحب نے شعر و شاعری کے متعلق دیوان کے دیباچہ میں بہت سے نکتے لکھے ہیں جن سے اس فن کے متعلق مفید نتائج حاصل ہو سکتے ہیں غرۃ الکمال کے دیباچہ میں اس پر بحث کی ہے کہ فارسی اور عربی شاعری میں کس کو ترجیح ہے۔ فیصلہ فارسی کے حق میں کیا ہے اور اس کی یہ دلیلیں لکھی ہیں:

(۱) عربی میں ایسے زحافات ہیں کہ اگر فارسی میں ہوں تو کلام ناموزوں ہو جائے۔ اس سے ثابت ہے کہ فارسی کے اوزان ایسے منضبط اور لطیف ہیں کہ ذرا سی کمی بیشی برداشت نہیں کر سکتے۔

(۲) عربی زبان میں ایک ایک چیز کے لئے متعدد مرادف الفاظ ہیں

اس لئے شاعری آسان ہے۔ ایک لفظ کسی وزن یا بحر میں نہ کھپ سکا تو دوسرا موجود ہے بخلاف اس کے فارسی میں نہایت محدود الفاظ ہیں باوجود اس کے فارسی شعرا پر میدان شاعری تنگ نہیں۔

(۳) عربی زبان میں صرف قافیہ ہے ردیف نہیں۔

اب غور کرو عربی زبان کو متعدد طرح کی وسعت حاصل ہے۔ وزن اتنا وسیع کہ جتنے زحافات چاہیں استعمال کرتے جائیں۔ لفظوں کی یہ بہتات کہ ایک لفظ کے بجائے دوسرا اور دوسرے کے بجائے تیسرا موجود ہے۔ ردیف کی سرے سے ضرورت ہی نہیں۔ نرے قافیہ پر مدار ہے۔ جس قدر قافیہ ملتے جائیں کہتے جاؤ۔ اِن سب وسعتوں کے ساتھ عربی شاعری فارسی شاعری پر غالب نہیں آسکتی۔

اس کے علاوہ عرب کا شاعر اگر ایران میں آئے اور برسوں قیام کرے تاہم فارسی زبان میں شعر نہیں کہہ سکتا۔ لیکن ایران کا شاعر بے تکلف عربی میں شاعری کر سکتا ہے۔ زمخشری اور سیبویہ عجمی تھے لیکن زبان دانی میں عرب عربا سے کم نہ تھے۔ فارسی کے وجوہ ترجیح لکھ کر لکھتے ہیں کہ " اور بہت سے وجوہ ہیں لیکن میں اس لئے قلم انداز کرتا ہوں کہ کوئی مذہبی تعصب کے پردہ میں مخالفت پر نہ آمادہ ہو جائے۔

<u>خصوصیات شاعری</u>۔ امیر خسرو فن شاعری میں جن خصوصیات

کے لحاظ سے ممتاز ہیں۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) ایران میں جس قدر شعرا گذرے ہیں۔ خاص خاص صناف شاعری میں کمال رکھتے تھے۔ مثلاً فردوسی و نظامی مثنوی میں۔ انوری اور کمال قصائد میں۔ سعدی اور حافظ غزل میں۔ یہی لوگ جب دوسری صنف میں ہات ڈالتے ہیں تو پھیکے پڑجاتے ہیں۔ بخلاف اس کے امیر صاحب قصائد۔ مثنوی۔ اور غزل تینوں میں ایک درجہ پر لکھتے ہیں۔ مثنوی میں نظامی کے بعد آجتک ان کا جواب نہیں ہوا۔ غزل میں وہ سعدی کے دوش بدوش ہیں۔ قصائد میں ان کی چنداں شہرت نہیں ہوئی لیکن کلام موجود ہے۔ مقابلہ کرکے دیکھ لو۔ کمال اور ظہیر سے ایک قدم پیچھے نہیں۔ تفصیل اس کی آگے آتی ہے۔

(۲) ایشیائی شاعری پر یہ عام اعتراض ہے کہ خاص خاص چیزوں پر نظمیں نہیں لکھی گئیں۔ مثلاً قلم۔ کاغذ۔ کشتی۔ دریا۔ شمع۔ صراحی جام۔ خاص خاص میوؤں اور پھولوں وغیرہ وغیرہ پر ایسی مسلسل اور لمبی نظمیں نہیں ملتیں۔ جن سے ان کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے۔ امیر صاحب نے ایشیائی شاعری کی اس کمی کو پورا کردیا۔ انھوں نے قران السعدین میں اکثر اسی قسم کی نظمیں لکھی ہیں۔ اور اس کتاب سے ان کا بڑا مقصد اس قسم کی شاعری کا نمونہ قائم کرنا تھا۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں۔

بود در اندیشۂ من چند گاہ | کز دل دانندۂ حکمت پناہ
چند صفت گویم و آبش دہم | مجمع او صاف خطابش دہم
طرز سخن را روشش نو دہم | سکۂ آں ملک بہ خسرو دہم
سکۂ خود زیں فن اندیشہ زائے | تا نہ نشانم بہ نشیمن زپاے
وصف نہ زاں گونہ شد از دل بروں | کاں ہو گرے را بدل آید کہ چوں

اس قسم کی شاعری کا نام امیر صاحب نے وصف نگاری رکھا۔ اور یہ نہایت موزوں نام ہے۔ اگرچہ افسوس ہے کہ زمانہ کے مذاق کے لحاظ سے اس میں نیچر کا پورا رنگ نہیں آیا۔ بلکہ تکلف اور مضمون آفرینی کا رنگ چڑھا یا ہو تاہم جس قدر ہے غنیمت ہے۔

کاغذ کی تعریف

کاغذ[1] شامی نسب و صبح دام | آں کہ شد آرایش صبحش ز شام
سادہ حریرے دلے اصلش ز خویش | با نسبِ خز شدہ پیوند خویش
تا رے حریر آمدہ اندر نورد | طرفہ حریرے کہ تواں جزو کرد
آمدہ اجزاش فراہم ز آب[2] | لیک پراگندگیش ہم ز آب

[1] معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ تک کاغذ شام سے آتا تھا ۱۲ [2] اس سے ثابت ہوتا ہو کہ پہلے بھی اسی طرح کاغذ بناتے تھے کہ ردی اور کپڑے کے چیتھڑوں کو پانی میں بھگو کر پانی کیطرح سیال بنا لیتے تھے۔ پھر وہ خشک ہو کر کاغذ ہو جاتا تھا۔

بسکه شد از کوبش بسیار پست — پشت دوتا گردش از ننگ شکست

گه بود از دستهٔ تیغش گذر — گه دهد از تیغ به مقراض سر

گه خلد سوزن مسطر کشد — گه کشش رشتهٔ دفتر کشد

حرف بحرف از قلم آرد سخن — لیک به پیچد همه بر خویشتن

بہت سے شعر لکھے ہیں ہمنے قلم انداز کر دیے۔

کشتی کی تعریف

ساخته از حکمت کار آگہاں — خانهٔ گردنده به گرد جہاں

نادرهٔ حکم صدائے حکیم — خانه رواں خانگیانش مقیم

اهل سفر را همه بردے گذر — همره زن ساکن واو در سفر

جاریهٔ هند زبانش سلیم — حامل چندیں بچه لیکن عقیم

بیشتر از مرغ پرد در گشاد — پیشتر از باد رود روز باد

رفته دو منزل به دمے بل دو چند — بار رسن و سلسله و تخته بند

همچو کلنگاں به هوا سر فراز — پر چو حواصل زد و سو کرده باز

هر طرفش ره به شتاب دگر — هر قدمش بر سر آب دگر

گرچه به دریا گذر و بیش و کم — آب نباشد گمرش تا شکم

دست چو در آب فراز افگند — آب بدست آرد و باز افگند

لطمه زده بر رخ دریا به زور — آب ازاں لطمه به فریاد و شور

در رہ بے آب نداند شدن کیست کہ بے آب تواند شدن!

(۳) تشبیہ شاعری کے چہرہ کا غازہ ہے۔ لیکن تقلید پرستی نے یہ حالت پیدا کر دی تھی کہ جن چیزوں کی جو تشبیہیں ایک دفعہ قدما کے قلم سے نکل گئیں ان کے سوا گویا دنیا کی تمام چیزیں بیکار تھیں۔ امیر صاحب نے بہت سی نئی تشبیہیں خود پیدا کیں۔ چنانچہ غزۃ الکمال میں خود لکھتے ہیں

تشبیہات تو بسیار است ایں محل جملہ را تحمل نتواند کرد۔ اما دو سہ نظیر برائے یاد کردن گزر شدہ۔

اسکے بعد دو تین مثالیں لکھی ہیں۔

ز انتظار در دامنت ساق توصید چشم بزیر ہر موئے دارم چو دام ماہی گیر

فرہ ہائے کثر دل آویزت کثرہائے دوکان قصاب است

زہے خرامش آں نازنیں بہ عیاری کبوترے بہ نشاط آمدست پنداری

امیر صاحب چونکہ ہندی زبان سے آشنا تھے اس لئے تشبیہات میں ان کو برج بھاکا کے سرمایہ سے بہت مدد ملی ہوگی۔ آخیر شعر غالباً اسی خرمن کی خوشہ چینی ہے۔ فارسی شعرا معشوق کی رفتار کو کبک کی رفتار سے تشبیہ دیتے تھے۔ ہندی میں ہنس کی چال عام تشبیہ ہے۔ لیکن کبوتر مستی کی حالت جس طرح چلتا ہے وہ مستانہ خرام کی سب سے اچھی تصویر ہے۔

قصیدہ۔ مثنوی۔ غزل میں اُنھوں نے جو جدتیں پیدا کیں اُن کی تفصیل علٰحدہ علٰحدہ عنوان میں آگے آتی ہے۔

مثنوی

مثنوی میں جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں۔ نظامی کے پیرو ہیں نظامی کے پنج گنج میں تین قسم کی مثنویاں ہیں۔ رزمیہ عشقیہ صوفیانہ امیر صاحب نے بھی تینوں مضامین کو لیا ہے اور ہر رنگ کو نظامی کے انداز میں لکھا ہو

ایک ایک مثنوی پر ریویو کرنا خاص ان کے سوانح نگار کا کام ہو البتہ نمایاں مثنویوں کا ذکر کرنا ضروری ہے۔

قران السعدین۔ یہ سب سے پہلی مثنوی ہے جو ۳۶ برس کی عمر میں لکھی۔ اس لئے اس میں تکلف اور آورد بہت ہے۔ لیکن باوجود اس کے اکثر جگہ نہایت بلند رواں اور برجستہ ہے۔ مثنوی کا قصہ نہایت بیہودہ تھا۔ یعنی باپ بیٹوں کی مخالفانہ خط وکتابت اور حملہ کی تیاری۔ بیٹا یعنی کیقباد نہایت گستاخ اور بے تمیز تھا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ وہی صاحب تخت تھا اور اُسی کی فرمائش سے یہ مثنوی لکھی گئی۔ بیٹا یہ بھی چاہتا تھا کہ اس کی گستاخیاں جن کو وہ اپنی دلیری کے کارنامے سمجھتا تھا مفصل اور آب ورنگ کے ساتھ لکھی جائیں۔ اور یہ ثابت کیا جائے کہ باپ کے ہوتے تخت سلطنت کا مستحق بیٹا ہے۔ اس جھوٹی منطق کو امیر صاحب نے جہاں تک ہو سکا خوب نباہا ہے۔ چنانچہ بیٹے کی زبان سے کہتے ہیں۔

گر بہ گہر تاج ستاں توام — عیب مکن گوہر کانِ توام
ور ہوس تاج ترا در سر است — من گہرم تاج مرا در خور است
چوں سرم از بخت سرافراز گشت — تاج تو بر تارکِ من بازگشت
تخت جہاں ہر تو بپاے کرد — لیک براں تخت مرا جاے کرد
ملک بہ میراث نیابد کسے — تا نہ زند تیغ دو دستی بسے
از تو اگر نام پدر روشن است — خطبہ جدید ہیں کہ بنام من است
ہر دو جدائیم من و بخت من — بازو چو آں پنجہ ہم در مزن
گرچہ برویت نہ کشیم ندستیز — از پئے تعظیم تو شمشیر تیز
لیک تو دانی کہ چو کیں آورم — شیر فلک را بہ زمیں آورم
جز تو کسے گردم ازیں در زدے — سر ز تنش تیغ منش سر زدے
لیک تو ئی چوں بہ بجائے این سریر — من نہ ہم گر تو توانی بگیر

باپ نے جو جواب لکھا ہے دیکھو کس طرح حرف حرف پدرانہ محبت کے نشہ سے چور ہے

اے ز نسب گشتہ سزائے سریر — در بسری ہیچو پدر بے نظیر
گرچہ غبار است ز کارِ توام — سرمۂ چشم است غبار توام
تا تو ندانی کہ دریں گفتگوے — از پئے ملک است مرا گفتگوے
گرچہ توانم ز تو ایں پایہ برد — از تو ستانم بگر خواہم سپرد
شکر کہ شد زندہ در ایام تو — من ز تو و نام من از نام تو

باش بہ کامم کہ بکام توام | زندہ و نا زندہ بنام توام
خواہمت از جان کہ پناہی مرا | ور تو بہ خواہی و نہ خواہی مرا
جز بہ تمنائے تو سودام نیست | بہتر ازیں ہیچ تمنام نیست
گرچہ کہ سلطان جہانم بہ ملک | تاج دہ و تخت ستانم بہ ملک
لیک چو دورم ز تو اے نیکبخت | نے خوشم از تاج و نہ شادم ز تخت
بخت من از پایۂ بالا فلاک سود | با تو چو یک دم نہ نشینم چہ سود

ان خارا گداز الفاظ نے بیٹے کے دل پر بھی اثر کیا۔ اب اسکا لہجہ بدل جاتا ہے اور فرزندانہ جوش محبت میں کہتا ہے۔

من کہ گلے رستہ باغ توام | پرتوے از نور چراغ توام
گر ہمہ بر ماہ رسد افسرم | ہم بہ تہ پائے تو باشد سرم
زابر خود کن تو اشارت بچیں | من سر خاقان فگنم بر زمیں
تاج ز من ۔ سر ز تو افراختن | عاج ز تو تخت ز من ساختن
دہ بہ ملاقات رہی رائے تست | افسر من خدمتی پائے تست
نیست مرا آں محل و آں شکوہ | کز سر خود سایہ فشانم بکوہ

باپ جب بیٹے سے ملنے آیا ہے تو بیٹا تخت شاہی پر متمکن تھا۔ باپ کو دیکھکر بے اختیار تخت سے اترا اور باپ کی طرف بڑھا۔ باپ نے چھاتی سے لگایا دیر تک دونوں جوش محبت میں ایک دوسرے سے جدا نہ ہوتے تھے۔

پھر بیٹے نے باپ کو لیجا کر تخت پر بٹھایا۔

گرم فرو جست ز تخت بلند ۔۔۔ کرد بہ آغوش تن ارجمند
داشت بہ آغوش خودش تا بدیر ۔۔۔ سیر نہ شد چوں شود از عمر سیر
با خودش از فرش بہ اورنگ برد ۔۔۔ تخت کیاں باز کیاں را سپرد
گاہ ز دیدہ بہ نثارش گرفت ۔۔۔ گاہ دوبارہ بہ کنارش گرفت
گاہ نظر بر رُخِ زیباش کرد ۔۔۔ گاہ دل از مہر شکیباش کرد
پرسش از اندازہ زغایت گذشت ۔۔۔ حد نوازش ز عنایت گذشت

قران السعدین کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ نظم اور لطائف نظم کی پابندی کے ساتھ تاریخی حیثیتیں تمام ملحوظ رکھی گئی ہیں۔ اسی طرح کہ کوئی نثر لکھتا تو اس سے بڑھکر ان باتوں کو نہ لکھتا۔

خمسہ میں پانچ مثنویاں ہیں یعنی مطلع الانوار۔ شیریں خسرو لیلی مجنوں آئینہ اسکندری۔ ہشت بہشت۔

جس ترتیب سے ہم نے ان کتابوں کے نام لکھے ہیں۔ یہی اُن کی تصنیف کی ترتیب ہے۔ چنانچہ امیر صاحب نے خود ہشت بہشت میں تصریح کی ہے۔ اِن پانچوں کتابوں کی تصنیف کا زمانہ کل سوا دو برس ہے اور یہ قادر الکلامی اور پرگوئی کا حیرت انگیز اعجاز ہے۔

اگرچہ اس میں شبہہ نہیں کہ نظامی کے جواب میں جس قدر خمسے

لکھے گئے اُن میں نسبتہً امیر صاحب کا خمسہ سب سے بہتر ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں بعض نظامی کی تصنیف سے کچھ نسبت نہیں رکھتیں۔ مطلع الانوار میں صاف خامی نظر آتی ہے اور آئینۂ اسکندری بالکل پھیکی اور کمزور ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خود امیر صاحب کے دل میں بے اطمینانی تھی۔ آئینۂ اسکندری میں لکھتے ہیں۔

دگر باز گیری تو پیوند خویش | مرا خود غرض راست فرزند خویش
سزد گر چو آواز خر خندہ را | بود از غنواں گوش خرندہ را
برد باد بخشائیش دادگر | کہ بر من بہ بخشش گمارد نظر
ہنر جوے در عیب چالی مکوش | ترا نیز عیبے ست بر خود بپوش

نظامی کے پرزور رزمیہ معرکوں کے مقابلہ میں ان کے زور طبع کا یہ نمونہ ہے

بہ گردوں شد از نائے زریں خروش | بہ دریاے لشکر در افتاد جوش
ہزاہز در آمد بہ ہر دو سپاہ | رد از در در آمد بخورشید و ماہ
علم سر ز عیوق بر تر کشید | سناں چشم سیارہ بر سر کشید
بیاباں ہمہ بیشۂ شیر گشت | جہانے پر از تیر و شمشیر گشت
غبار زمیں کلہ برماہ بست | نفس را در دل گذرگاہ بست
چناں گشت روے ہوا گردناک | کہ سیارہ گم کرد خود را بخاک
سیاہ از رہ موج زن تا باوج | چو دریا کہ بادش در آرد بموج

بہ دریائے آہن جہاں گشتہ غرق ہوا پر ز منغ و زمیں پر ز برق
ز بانگ ہیونان گیتی نورد شدہ پر صدا گنبد لاجورد
عرق کردن توسناں در شتاب ز دریائے آتش برانگیخت آب
شرارہ کہ زد نعل ہنگام رو ستارہ برون ریخت از ماہِ نو
نفیر زہ از چاشنی کماں شدہ چاشنی بخش جاں ہر زماں
گرہ بر گرہ دشت پیکاں زناں زرہ بر زرہ پشت روئیں تناں
بزیر سپر تیغ رخشاں بتاب چناں کز تہ برگ نیلوفر آب

اس کمی کے مختلف اسباب ہیں۔ مثنوی امیر صاحب کا اصلی مذاق نہیں سلاطین کی فرمائش سے وہ مثنویاں لکھتے تھے اور گویا بیگار ٹالتے تھے چنانچہ خمسہ کا خمسہ دو سوا دو برس میں لکھا ہے اور مطلع الانوار تو صرف دو ہفتہ کی کمائی ہے۔

ان کتابوں کی تصنیف کے زمانہ میں دربار کی خدمتوں سے بہت کم فرصت ملتی تھی۔ لیلیٰ مجنوں کے خاتمہ میں لکھتے ہیں کہ نظامی کو شاعری کے سوا کوئی شغل نہ تھا اور کسی قسم کی بے اطمینانی نہ تھی۔ میرا یہ حال ہے کہ پانوں کا پسینہ سر پر چڑھتا ہے تب روٹی ملتی ہے۔

مسکین من مستمند بیہوش از سوختگی چو دیگ در جوش
شب تا سحر و ز صبح تا شام در گوشۂ غم نگیرم آرام

باشمِ زبرائے نفس خود راست   پیش چو خودے ستادہ بر پائے

تا خون نہ رود زپائے تا سر   دستم نہ شود ز آب کس تر

اس خمسہ میں ایک کتاب ان کے خاص مذاق کی ہے۔ یعنی لیلی مجنوں اگرچہ اس کتاب میں بھی انھوں نے خاکساری سے نظامی کے سامنے اپنے آپ کو ہیچ کہا ہے۔

میداد چو نظم نامہ را تیح   باقی نہ گذاشت بہرِ ما ہیچ

لیکن انصاف یہ ہے کہ ان کی لیلیٰ مجنوں اور نظامی کی لیلیٰ مجنوں میں اگر کچھ فرق ہے تو اس قدر نازک ہے کہ خود وہی اس کو سمجھ سکتے ہیں۔

اس کتاب میں ہر قسم کی شاعری کے موقع پیدا کئے ہیں۔ اور ان کا کمال دکھایا ہے۔ مثلاً ایک موقع پر دھوپ کی شدت اور گرمی کا سماں دکھاتے ہیں۔

آتش زدہ گشتہ کوہ وکاں ہم   تفتیدہ زمین وآسماں ہم

جائے نہ کہ دیدہ را بر دخواب   ابرے نہ کہ تشنہ را دہد آب

مرغان چمن خزیدہ در شاخ   در رفتہ چرندگاں بہ سوراخ

ریگ از تفِ بختہ درگرانی   چوں نانِ تنورِ میہمانی

از گرمی ریگہائے گرداں   پُر آبلہ پائے رہ نوردان

عشق و محبت کے جذبات کے دکھانے کا اس سے بڑھ کر کون سا موقع مل سکتا تھا۔ اس لحاظ سے اس مثنوی کا ہر شعر گویا ایک پر درد غزل ہے مگر لیلیٰ کا واقعہ عموماً مشہور ہے اور شعرا نے اس دلچسپ روایت کو

طرح طرح سے رنگا ہے۔ امیر صاحب نے اس کو سب سے زیادہ موثر طریقہ سے ادا کیا ہے۔ مجنوں۔ کتے سے خطاب کرتا ہے:۔

ہستیم من، و تو ہر دو شب گرد ۔ لیکن تو بہ نالۂ من از درد
چوں باز گذر کنی دراں کوے ۔ بر خاک درش زمن بنی روے
ہر خس کہ برو گذاشت گامے ۔ از من برسانیش سلامے
ہر جا کہ نہاد پاے روشن ۔ زنہار بہ بوسی از لب من
خواہد چو ترا درون ز لہیز ۔ یادش دہی از سگ دگر نیز
زنجیر خودت نہد چو بر دوش ۔ از گردن من مکن فراموش

اس پیرایۂ ادا کو دیکھو۔ کہتے ہیں کہ جب لیلیٰ تجھکو ڈیوڑھی کے اندر بلائے تو ایک اور سگ در کو یاد دلا دینا۔ جب لیلیٰ تیری گردن میں طوق ڈالے تو دیکھ میری گردن کو بھول نہ جانا۔

عاشق کا پیغام و سلام سب لکھتے ہیں۔ لیکن معشوق عاشق کو کیا لکھتا ہے۔ نہایت نازک مقام ہے۔ دیکھو امیر صاحب اس نازک موقع کو کیونکر نباہتے ہیں۔ لیلیٰ مجنوں کو لکھتی ہے:۔

اے عاشق دور ماندہ چونی ۔ وے شمع ز نور ماندہ چونی
روزت دانم کہ شب نشان است ۔ شبہاے سیاہ بر چہ سان است
از من بکہ مے بری حکایت ۔ باخود ز کہ می کنی شکایت

درگوش کہ؟ نالہ می رسانی ۔۔۔ در پاے کہ؟ قطرہ می فشانی
بازارِ تو در کدام سوی است ۔۔۔ سیلاب تو در کدام جوی است

معشوق اس قدر ضرور جانتا ہے کہ عاشق رونے دھونے اور درد دل کہنے سے باز نہیں رہ سکتا اب اس کی غیرت یہ سوالات پیدا کرتی ہے کہ کس کے سامنے روتا ہے! کس سے درد دل بیان کرتا ہے؟ کس کے آگے میرا نام لیتا ہے۔ یہ باتیں نورانہ واری اور معشوق پرستی کے نکات ہیں۔ ان سچے جذبات اور خیالات کو کس خوبی سے ادا کیا ہے۔

آئینہ اسکندری پھیکی ہے لیکن اس کتاب میں بھی ان کے مذاق کا جو میدان آیا ہے اُس میں وہ نظامی کے دوش بدوش ہیں۔ نظامی نے سکندر اور بت چینی کی بزم آرائی کا قصہ بڑی آب و تاب سے لکھا ہے خاص اُس موقع پر خوب زور طبع دکھایا ہے جہاں وہ دلربا سکندر کی ایک ایک بات پر اپنی ترجیح ثابت کرتی ہے۔

امیر صاحب نے بھی یہ معرکہ باندھا ہے اور اسی طرح بت چینی کا فخریہ لکھا ہے نظامی کے فخریہ سے ملا کر دیکھو۔ معشوق چینی کہتا ہے اور سکندر کے ایک ایک وصف کے مقابلہ میں اپنی ترجیح ثابت کرتا ہے۔

مشعبد کہ داند جہاں سوختن ۔۔۔ زمن بایدش بازی آموختن
ہمہ خون خوبان کشتی می خورم ۔۔۔ دلے نوش با دم کہ خوش میخورم

مدرغ ہر صنم ناپدید از من است | صنم خانہ ہا را کلید از من است
سپہر آفتاب زمیں خوانذم | دگر ماہ بیند ہمیں خوانذم
سکندر کہ کرد آب حیواں ہوس | نظیر منش بود مقصود و بس
گر او ہست کیخسرو جام جوے | مرا جام گیتی نما نیست روئے
گر انہ مجلس او سمن سے دمد | مرا لالہ و گل ز زتن سے دمد
گر او راست بر تخت جائے نشست | مرا در دل اوست جائے نشست
گر او تاج خواہد ز شاہاں خراج | من از سروراں بستانم تاج
گر اقبال و دولت درآیا درند | مرا ہر دو چوں کمتریں چاکراند
گر او دشمناں را بخوں خوردن است | مرا نعل صد دست بر گردن است
گر او را یکے آئینہ بر کف نشست | دو آئینہ دارم من از پشت و شت
کماں از سے ارصد شکار افگند | یکے ابرو سے من صد ہزار افگند
کمند وسے از صید بند و ندام | من آنم کہ صیاد گیر و بدام
گر اورا کلاہ سے است بر آسمان | مرا صد کلاہ است بر آستاں

ہشت بہشت ۔ یہ سب سے اخیر مثنوی ہے اور امیر صاحب کی شاعری اس میں پختگی اور پرکاری کی اخیر حد تک پہنچ گئی ہے ۔ خاص خوبات اس میں ہے وہ واقعہ نگاری کا کمال ہے ۔ ساری کتاب میں فرضی حکایتیں لکھی ہیں ۔ لیکن یہ التزام کیا ہے کہ جو واقعہ لکھا جائے اُس کے

نہایت چھوٹے چھوٹے جزئیات حسن کے ادا کرنے سے زبان قاصر ہوتی جاتی ہے ادا ہوجائیں۔

تمام کتاب کا یہی انداز ہے اور اس خصوصیت کے لحاظ سے فارسی زبان کی کوئی مثنوی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

مثلاً ایک قصہ لکھا ہے کہ حسن ایک سنار تھا۔ اس کو بادشاہ نے ایک جرم کی بنا پر یہ سزا دی کہ ایک اونچی لاٹ پر چڑھوا دیا۔ حسن کی بیوی لاٹ کے پاس گئی۔ حسن نے لاٹ پر سے کہا کہ بازار سے ریشم اور قند لا جب وہ لائی تو کہا کہ ریشم کے تار کے سرے پر قند چپکا کر کسی چیونٹی کے منھ میں جو لاٹ پر چڑھ رہی ہو دیدے۔ اور خود جلد جلد تار کی گولی کھولتی جائے۔ چیونٹی تار کو لئے ہوئے۔ اوپر چڑھتی چلی گئی۔ حسن کے قریب پہنچی تو حسن نے تار کو لیکر اس سے رسی بٹی۔ اور پھر ایک خاص تدبیر سے اسی کے سہارے نیچے اترا۔ تمام قصہ بہت لمبا ہے۔ ابتدا کے چند شعر ہم نقل کرتے ہیں۔

کہ زنش در رسید با کالا	چون نگہ کرد خواجہ از بالا
پارۂ قند کن بر دودی یار	دادش آواز گفت بر سر تار
تا بالاش می رود تعجیل	دہ بمورے کہ می رود بر میل
کز نشیب آورد بسوے فراز	رشتہ را زود می کن باز

ہمچناں کرد زن کہ او فرمود — داد رشتہ بمو رد مور ربود

مانند بالائے میل تار کشاں — رسن فتنہ بہ حصار کشاں

چوں بنزدیک خنہ رفت بزور — ریسماں را ربود خواجہ زدو

قصائد قصیدہ میں ان کا کوئی خاص انداز نہیں ہے۔ کمال۔ اسمٰعیل۔ خاقانی اور انوری کی تقلید کرتے ہیں۔ اور جس کے جواب میں قصیدہ کہتے ہیں۔ اُس کا تتبع کرتے ہیں۔ خاقانی کا مشہور قصیدہ ہے۔

مجلس دو آتش دادہ۔ برایں از شجر شاں انجیر — ایں کرد نقل ز مقرداں جام را جا داشتہ

اس کے جواب میں بہت بڑا قصیدہ لکھا ہے۔ وہی انداز۔ وہی ترکیبیں وہی استعارے ہیں۔ اور چونکہ خاقانی کا مقابلہ ہے۔ اس لئے ۷۰ شعر کہہ کر دم لیا ہے۔ اس میں بھی واقعہ نگاری کا خاص انداز قائم ہے۔ عید کا بیان کیا ہے اور عید کا پورا سماں دکھایا ہے۔

ہر سو جواناں نو سلب۔ ہر سو عروساں در تعب — طفلاں نہ خفتہ از طرب دیدہ بہ فردا داشتہ

از شیر و خرما مرد و زن در شیر خوار دہن — چوں شیر خوراں در دہن پستاں خرما داشتہ

خورشید چوں سر بر زدہ۔ ہر کس براہِ در شدہ — ایں دو بسوی میکدہ۔ او در مصلا داشتہ

فاسق کہے نا خوردہ کہ۔ در عید کہ بیہودہ — سر بر بساطِ سجدہ کہ دل سوئے بادہ داشتہ

دارو ئے معلول شدے۔ بل جانِ مخلول استے — خورشید منخول استے۔ در طاس مینا داشتہ

ان کے قصائد میں مدحیہ مضامین ہمیشہ بدمزہ اور پھیکے ہوتے ہیں۔ جس کی

وجہ یہ ہے کہ مدح دل سے اُن کو پسند نہیں۔ صرف معاش کی ضرورت سے بذلت گوارا کرتے ہیں۔ اس لئے قصیدہ میں اور راہ اور مضامین کہ لیتے ہیں اور اُن میں زورِ طبع دکھاتے ہیں۔ مثلاً بہار کا سماں۔ برسات کی رُت۔ صبح و شام کی کیفیت۔ ایک قصیدہ میں برسات کے آغاز سے تمہید شروع کی ہے اور صرف مطلع میں سب کچھ کہدیا ہے۔

زدانہ نمو شگفتہ ہمی را نمی‌کند ‌‌ تحیر آمد کہ سبزہ چہ فتنہ ہا سر می‌کند

سپیدہ دم کہ صبا گشت دہقاں نوروز ‌‌ بساط خاک زنیادہ بر زباں فرمود

چو نشو و نمائے گل آفتاب بنوشت ‌‌ زمانہ بر سرِ گل از ابر سایہاں فرمود

زلالہ خواست چمن ساغر و سبک بخشید ‌‌ زابر خواست زمیں قربت روانی[ف۵] فرمود

ہر آنچہ بندہ قرض نما غنچہ بگل زرفت ‌‌ بنفشہ گوش نہاد و صبا بیاں فرمود

صبح کا سماں

سپیدہ دم کہ نکہت زشبنمی گہماں دار ‌‌ نسیم غالیہ در دامن گلستاں دار

چو صبح پیر بہ رخ زرد سپیدی ز سرخی ‌‌ بہ تشت آئینہ داد آفتاب خنداں دار

در دست مغربی آفتاب را کہ فلک ‌‌ نہاد زیر زمیں با مدار تاباں دار

ستارہ را زچہ شد دید چہرۂ خورشید ‌‌ چو شب زخم مینایش سر بہ چنداں دار

ف۵ رواں فرمودن۔ نوازش کرنا

غلامِ بادِ صبا ام کہ بامداد پگاہ ‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌ صلائے عیش بعشرت سرائے ستان داد

باغ

نوبہار است و چمن جلوہ چو حورا کردہ ‌‌‌ ابر بارِ رحمتی لولوی لالا کردہ
گرد طرۂ سنبل کہ صبا باز نہادہ ‌‌‌ دامن لالہ پر از عنبر سارا کردہ
بر گل و لالہ و سبزہ آنکہ قمری ‌‌‌ پای آلودہ بخون پاچہ بالا کردہ
عاشقان رفتہ بگلزار و دل خستہ را ‌‌‌ بے تکلف ز گل و لالہ شکیبا کردہ

نوبہارا سال ما را مژدہ فرماید ہمی ‌‌‌ گل خیابان تر دامن از رے لعب زیبا آید ہمی
بر دہان غنچہ گہ گہ می زند بوسہ نسیم ‌‌‌ کان شکر لب جز بہ بوسہ روزہ بکشاید ہمی
باد در کہسار جام لالہ را بر سنگ زد ‌‌‌ گل بخندہ گفت آرے این چنین باید ہمی
نرگس رعنا قدح بر دست و چشم اندر ہوا ‌‌‌ گو ئیا می خوارہ ماہ عید را باید ہمی
(گویا شراب خوار ماہ عید کو ڈھونڈھتا ہے)

برسات

ہوائے خرم است و ہر طرف باراں ہمی بارد ‌‌‌ نگویم قطرہ کز بالائے گل ریحاں ہمی بارد
نگوں سر شاخہائے سبز گوئی در ہمی چیند ‌‌‌ زبس کا بر درافشاں لولوئے غلطاں ہمی بارد
یعنی شاخیں جو جھکی ہوئی ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بادل نے جو زمین پر موتی برسائے ہیں یہ ان کے رولنے کو جھکی ہیں۔

چکاں قطرہ زسرہائے نارتر تو پنداری ‌ ‌ کہ ہر دانہ کہ بودہ است اندروں نہاں ہمی بارد
خوش آں دقیقہ کہ مطرب درسماع نیکواں خوش ‌ ‌ خراماں درمیاں سبزہ و باراں ہمی بارد

بعض قصائد سراپا موعظت و اخلاق میں ہیں۔ ان میں بحر الابرار جو بڑا اسیر حاصل قصیدہ ہی مشہور ہی۔ التزام کیا ہی کہ ہر شعر میں دعوی اور اسکے ساتھ دلیل ہو

کوس شہ خالی و بانگ غلغلش در دسراست ‌ ‌ ہر کہ قانع شد بہ خشک و تر شہ بحر و بر است
عاشقی رنج است مرداں البسینہ راحت است ‌ ‌ سلسلہ بند است شیراں راگردن زیور است

یعنی عاشقی میں گو تکلیف ہے۔ لیکن مردوں کو وہی آرام دہ ہی جس طرح شیر زنجیر میں بندھا ہوتا ہی اور یہی زنجیر اُس کا زیور ہی۔

مرد پنہاں در گلیمے پادشاہ عالم است ‌ ‌ تیغ خفتہ در نیامے پاسبان کشور است
راہرو چوں در رہ یا کو شد مرید شہوت است ‌ ‌ بیوہ زن چوں رخ بیاراید بہ بند شوہر است
نفس خاک پست ہرگہ نور بالا بر تو تافت ‌ ‌ سایہ زیر پا شود ہرگہ کہ بر تارک خور است
کار اینجا کن کہ تشویش است در محشر بسے ‌ ‌ آب اینجا بر کہ در دریا بسے شور و شر است
ناکسے ہر کہ حرص مال دارد دوزخی است ‌ ‌ عود و سرگیں ہرچہ در آتش فتد خاکستر است
اے برادر ہر کہ خوردت مرنج ‌ ‌ چوں ترا خواں برادر بہ ز شیر مادر است
در ہر خاکے را نمونہ میکند کیں مردم است ‌ ‌ بحر آبے را غلولہ میکند کیں گوہر است

اہل سخن کے نزدیک قصیدہ میں شاعر کی جدت طبع کا اندازہ تخلص یعنی گریز سے ہوتا ہے۔ اس معیار کے لحاظ سے امیر خسرو نے تمام ہمعصروں سے

ممتاز نظر آتے ہیں۔ ان کے مخالص کی چند مثالیں ذیل میں ہیں۔

برسات کے ذکر کے بعد

برآمد ابر در بخشش و گرزناں پایہ در غلغلہ　　نگیرد ہیچکس دستش مگر شاہ جہاں گیرد

بہار کی تمہید کے بعد

گل از کم عمر شد گو باش دانی　　کہ درخور کیست عمر جاوداں را

نہال باغ شاہی بکن حق آں کہ　　ز بزم اوست، رونق بوستاں را

کشادہ چہرہ کہ طبے شدم بر شے زمیں　　در ملک ،نمودم کہ آسماں این است

طلوع صبح کا بیان کرکے

صبح ما گفتم کہ خورشید کجاست　　آسماں روئے ملک بجو نمود

ندارد بر شے لن نازک ز گرما ہیچ آسیبے　　گر در سایۂ رایاتِ شاہ کامگار آمد

طلوع آفتاب کے بعد

خورشید جہانگیر مندار کہ در بزم　　شمشیر کشیدہ ملک المشرق برآمد

قصائد میں امیر صاحب نے جس قدر جدید مضامین ۔لطیف استعارات۔
نئی نئی تشبیہیں۔ گوناگون اسباب پیدا کئے اُس کا احاطہ نہیں ہو سکتا
ہم اس موقع پر صرف بہاریہ تمہید کے چند شعر اس لحاظ سے نقل کرتے ہیں

کہ بہار شعرا کا پامال میدان ہے لیکن امیر صاحب اس میں بھی سب سے الگ ہیں۔

بوستاں شگفت دروے لالہ خنداں گشت باز | بر رخ گل طرۂ سنبل پریشاں گشت باز
سبزہ خطے چند بہر خواندن بلبل نوشت | بلبل آنگہ از خط خوباں غزل خواں گشت باز
خون لالہ گوئیا خواہد چکید از تیغ کوہ | یا چکیدآں خوں کہ کوہ آلودہ اماں گشت باز

غزل

اوپر پڑھ آئے ہو کہ غزل قدماء کے زمانہ تک کوئی مستقل چیز نہ تھی۔ سعدی نے غزل کو غزل بنا دیا۔ امیر خسرو کی غزل گوئی پر تقریظ کرنی ہو تو صرف یہ کہنا کافی ہے کہ وہی خمخانہ سعدی کی شراب ہے جو دوبارہ کھنچکر تیز ہو گئی ہے۔

غزل کی جان کیا ہے؟ درد۔ سوز و گداز۔ جذبات۔ معاملات عشق و نیاز اس کے ساتھ یہ بھی شرط ہے کہ یہ جذبات اور معاملات جس زبان میں ادا کئے جائیں، وہی زبان ہو جس میں عاشق، معشوق سے راز و نیاز کی باتیں کرتا ہے یعنی سادہ ہو۔ بے تکلف ہو۔ نرم ہو۔ لطیف ہو۔ نیاز آمیز ہو۔ اس کے لئے یہ بھی ضرور ہے کہ چھوٹی چھوٹی بحریں ہوں۔ جملوں کی ترکیبوں میں نام کو بھی اُلجھاؤ نہ ہو۔ قریب الفہم خیالات ہوں۔ اس حد تک امیر صاحب شیخ سعدی کے دوش بدوش ہیں۔ لیکن وہ اس سے بھی آگے بڑھتے ہیں انھوں نے غزل کی اصلیت کے علاوہ کمال شاعری کی بہت سی چیزیں اضافہ کیں اور ایجادات اور اختراعات کے چمن کھلا دیے۔ یہ سب

اجمال تھا۔ تفصیل ذیل میں ہے۔
بحروں کی موزونی وہ اکثر شگفتہ اور چھوٹی چھوٹی بحریں اختیار کرتے ہیں جسمیں خواہمخواہ بات کو صفائی۔ سادگی۔ اور اختصار سے ادا کرنا پڑتا ہے مثلاً

سرے دارم کہ ساماں نیست اورا | بدل دردے۔ کہ درماں نیست اورا
فراموش کردہ عمرم روز راز آں کہ | شبے دارم کہ پایاں نیست اورا
بہ راہ انتظارم ہست چشمے | کہ خوابے ہم پریشاں نیست اورا

یار من دل ز دوستاں بر داشت | مہر دیرینہ از میاں بر داشت
در دل او نہ کرد کار ارچہ | سنگ را زنالہ ام فغاں بر داشت
وے بہ تندی بلند کرد ابرو | از پے کشتنم کماں بر داشت

آں دوست کہ بود بر گراں شد | واں صبر کہ داشتم نہاں شد
گفتم کہ اسیر کردی اے دل | دیدی کہ بعافیت ہماں شد
دل بر دگرے نہم و لیکن | عاشق بہ ستم نمی تواں شد

عاشقے را چو نامہ بار کنید | نام من بر سرش طراز کنید
گر شما دین عاشقاں دارید | بعد ازیں پیش بت نماز کنید

گاہ مردن شنید دام محمودؔ　　گفت رویم سوے آیاز کنید

داد من آن بت طراز نہ داد　　یا سخے نیز دل نواز نہ داد
خواب ما رہ بہ بست و باز نہ کرد　　دل ما را ببرد و باز نہ داد
تو چہ دانی نیاز مندی عشق　　چون خدا یت بکس نیاز نہ داد

سوز و گداز ۔ سوز و گداز کے خیالات جب وہ ادا کرتے ہیں تو معلو
ہوتا ہے کہ آگ سے دھواں اُٹھ رہا ہے ۔ اس میں بھی معشوق سے ا
حال کہہ رہے ہیں ۔ کبھی اپنی تصویر کھینچتے ہیں کبھی خود اپنے
آپ پر اُن کو رحم آتا ہے ۔

جز لے دست بُریدہ ئی کہ بیل نگذ نشتہ ئی ہلال　　لے سرت گردم ۔ چہ بیبرسی بد نجہاری نگہ

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ عاشق معشوق سے اپنی سرگذشت جب بیا
کرتا ہے تو تھوڑا سا کہہ کر اُس کو رونا آتا ہے ۔ ٹھہر جاتا ہے ۔ رو لیتا ہ
پھر آگے بڑھتا ہے ۔ اس کی تصویر کھینچتے ہیں ۔

خسروا مت شب افسانہ و باز دہر بار　　قدرے گریہ و لبس بر لب افسانہ د

زانوئش خسرو بہ نیمہ بہ نیافت　　سر نہادہ بر سر زانو بخفت

ملتا شناگر یہ کناں پند میدہی۔ آب زبوں مریز کہ آتش بکاں گرفت

کبھی کبھی عاشق کا دل کہتا ہو کہ صبر سے کام لینا چاہیئے۔ پھر دل پر غصہ آتا ہے اور کہتا ہے کہ کمبخت جو بات نہیں ہوسکتی اُس کے کہنے سے کیا فائدہ۔ اس معاملہ کو یوں باندھتے ہیں۔

غصہ ام می کشد اے دل سخن صبر مگو۔ دہ چرا گوئی از آں کار کہ نتوانی کرد

حسدی بردی اے دشمن بعقل و دانش خسرو۔ بیا تا بر مراد خاطر خود بینی اکنونش

رنج و غم کی اس سے بڑھ کر عبرت انگیز تصویر نہیں کھینچی جا سکتی۔ عاشق (جس کا فضل و کمال اور عقل اور سمجھ عموماً مسلم ہے) عاشق ہوکر تمام فضل و کمال اور عقل کھو چکا ہے۔ وہ اپنی حالت پر نظر ڈالتا ہے تو خیال آتا ہے کہ دشمنوں کی امید بر آئی۔ اس کو کس موثر طریقے سے ادا کیا ہے۔

جاں ز تن بردی و در جانی ہنوز۔ درد ہا دادی و درمانی ہنوز

گفتی اندر خواب گر گہ بینم خود بنمائیت۔ ایں سخن بیگانہ را گو آشنا را خواب نیست

غمزۂ تو بر دل سلطاں زند۔ ورنہ رنجی بر دل درویش ہم

یعنی تیرا غمزہ بادشاہوں کے دل پر حملہ کرتا ہے۔ اور بُرا نہ مان تو فقیروں پر بھی۔ "ورنہ رنجی" سے کس قدر عاشقانہ خضوع ظاہر ہوتا ہے۔

کشتم از تیغ جفایش خویش را . بر تو آساں کردم و بر خویش ہم

من کجا خسپم کہ از فریاد من شب نمی خسپد کسے در کوے تو

صبر طلب میکند از دل عاشق ہمچو خراج کہ بر خراب نویسند

یعنی معشوق، عاشق کے دل سے صبر چاہتے ہیں۔ یہ ایسی بات ہے کہ بنجر زمین پر محصول لگایا جائے۔

اے دیدہ چہ ریزی از بروں آب کیں شعلہ بہ جاں گرفت مارا
اے خواب! برو کہ باز امشب سودائے فلاں گرفت مارا

اے عشق کار تو بہ چو من تا کسے فتاد گویا کسے نماند جہان خراب را

دل ندارم غم جاناں بچہ بتوانم خورد پیش ازیں گرچہ غمے بود ولے ہم بودہ است
کس چہ داند کہ چہ رفت از غم تو دوش بمن از شب تیرہ خبر پرس کہ محرم بودہ است

بیا برو دستاں جاناں قضا کن ہر آں تیرے کہ بر دشمن خطا شد

دل باز سوے آں بت بدخو چہ میرود　　آں خو گرفتہ باز دہاں کوچہ میرود
جاں میرود ز تن چو گرہ میزند بزلف　　مردن مراست از گرہ او چہ میرود

گر ببینی دل ویرانِ مرا　　گو نیا ہیچ گہ آباد نبود

کافرے رخت یا دلم غارت کرد　　شہر اسلام و مرا داد نبود
——— میرا انصاف نہ کیا گیا

کرشمہ چند کنی بر من آخر این جاں است　　نمی دمد ز زمین و صبا نمی آرد
اس مضمون پر تین سو برس کے بعد آہلی نے یوں دست درازی کی۔
کرشمہ چند کنی بر من آخر این جاں است　　نمی دمد ز زمیں آسماں نمی بارد

بہ لبم رسید، جانم تو بیا کہ زندہ مانم　　پس از انکہ من نمانم بچہ کار خواہی آمد
جدت اسلوب ۔ غزل کی ترقی کا نوروز۔ لطفِ ادا ۔ اور جدت اسلوب
ہے جس کے موجد شیخ سعدی ہیں۔ لیکن پھر وہ نقش اولیں تھا امیر صاحب
کی بوقلموں طبیعت نے جدت اسلوب کے سیکڑوں نئے نئے پیرایے پیدا
کر دیے۔ جو اگلوں کے خواب و خیال میں نہ آئے تھے۔ مثلاً یہ مضمون کہ معشوق
ظلم و ستم کے ساتھ بھی محبوب ہے، یوں ادا کرتے ہیں۔

جاں زتن بردی و در جانی ہنوز　　درد ہا دادی و درمانی ہنوز

یا مثلاً معشوق کی گراں قدری کو اس پیرایہ میں ادا کرتے ہیں۔

ہر دو عالم قیمت خود گفتہ　　نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

معشوق کی آنکھ کو سب مخمور اور مے آلود باندھتے تھے۔ اسی مضمون کو دیکھو امیر صاحب نے کس انداز سے کہا ہے۔

مے حاجت نیست مستیم را　　در چشم تو خمار باشد

معشوق کا عاشقوں کے رنج و غم سے بے خبر ہونا۔ عام مضمون ہے اس کو کس لطف سے ادا کیا ہے۔

گل چہ داند کہ درد بلبل چیست　　او ہمیں کار رنگ و بو داند

معشوق معشوقانہ اداؤں کو چھوڑنا چاہتے ہیں۔ اس کو یوں باز رکھتے ہیں

مندلیراں بدل بسیار غارت کردنی دارد　　مسلمانی میاموز آں دو چشم نامسلماں را

رخصت کے وقت معشوق کو ٹھہراتے ہیں کہ میرے آنسو تھم جائیں تو جانا۔

می روی و گریہ می آید مرا　　ساعتے بنشیں کہ باراں بگذرد

لطف اور قہر کی نگاہ کی تاثیر کا فرق۔

گفتم چگونہ می کشی و زندہ می کنی　　از یک نگاہ کشت و نگاہ دگر نہ کرد

سعدی کا شعر ہے؟

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم　　باید اول بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی

یہ مضمون اگرچہ نیچرل ہونے کی حیثیت سے اس قدر اعلیٰ درجے کا تھا کہ اس پر ترقی نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن امیر صاحب نے ایک اور جدید اسلوب پیدا کیا۔

زغمزہ پرس کہ ایں شوخی از کجا آموخت　　　　بہ راحت جگر خستگاں چہ می پرسی

غالب نے اسی خیال کو اور زیادہ بدیع اور شوخ کر دیا ہے

یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں　　　　نظر لگے نہ کہیں اُن کے دست و بازو کو

معشوق کی آمد کی دلفریبی کو اس طریقے سے ادا کرتے ہیں۔

کہ در شہر مسلماناں چنا یں بے حجاب آمد　　　　بتے وآفت تقوی کہ خرابی ایمانی

اس مضمون کے ادا کرنے کا معمولی پیرایہ یہ تھا کہ معشوق کے آنے سے لوگوں کے زہد و تقویٰ میں فرق آتا ہے۔ بجائے اس کے خود معشوق سے خطاب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے شہر میں یوں نہیں آیا کرتے۔ گویا معشوق کا فتنہ انگیز ہونا اس قدر حد سے بڑھ گیا ہے کہ اپنی حالت کا خیال نہیں۔ بلکہ یہ فکر ہے کہ اسلام کی حالت خراب نہ ہو جائے۔

معشوق کی زیادتی لطف کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں۔

ما بوئے مست ساقی میدہد پیمانہ را　　　　جان زنظارہ خراب ناز او زاندازہ بیش

وحشی یزدی نے اسی خیال سے ایک اور لطیف خیال پیدا کیا۔

کہ زود آخر شود ایں بادہ من در خمار خم　　　　شراب لطف بر در جام میریزی بترسم

اکثر جگہ۔ صرف لفظوں کی الٹ پلٹ سے عجیب لطیف بات پیدا کر دیتے ہیں۔

چشم بد دور از نشانے روئے — کہ از و چشم دور شوال گرد

مردماں از من و بیہوشی من حیرانند — من در آں کس کہ ترا بیند و حیراں نشود

گفتیم ناخوش چرائی خسروا! — چوں گفتم با آں فدا ایں ناخوش است

گفتم کہ ترا ہمیں عشوا ہم — گر ہست گناہ من ہمیں است

دہنت ذرہ کم از ذرہ است — رخ ز خورشید ذرہ کم نیست

ابہام - یعنی ذومعنیں الفاظ سے عجیب عجیب نکتے پیدا کرتے ہیں۔

زبان شوخ من ترکی و من ترکی نمیدانم — چہ خوش بودے اگر بودے زبانش در دہان من

پیش ازیں بر خودم یقینے بود — کہ دلم ہیچ دلستاں نبرد
ق
تو بردی ہمہ یقین مرا — بطریقے کہ کس گماں نبرد

دی روئے تو دیدم و نہ مردم — شرمندہ بماندہ ام ز رویت

دیگری سر آں نیست کہ من زہد فروشم ساقی قدحے بادۂ گلرنگ بنوشم

اکثر جگہ جملۂ معترضہ یا جملۂ شرطیہ سے عجیب عجیب لطیفے پیدا کرتے ہیں۔
اور یہ اُن کا خاص مذاق ہے۔

بر وے باد الوسہ زن بر آں پائے دگر چیزے نگوید بر دہاں ہم

غمزۂ تو بر صف سلطاں زند ور نہ رنجی بر دل درویش ہم

بر فشکم آید کہ برم پیش تو نام دگراں دگر انصاف بود پیش تو ہم نتواں گفت

کشتم از تیغ جفایت خویش را پر تو آساں کردم و بر خویش ہم

غمے دارم کہ باد از دوستاں دور بجز دوستی کز دشمناں ہم

واقعہ گوئی اور معاملہ بندی مولوی غلام علی آزاد خزانۂ عامرہ میں لکھتے ہیں۔
مخفی نماند کہ ہنگامہ آرائے سخن طرازی شیخ سعدی کہ مروج طرز
غزل است خال خال نوع گوئی ہم دارد مثل ایں بیت۔

دل و جانم بتو مشغول و نظر در چپ و راست تا ندانند رقیباں کہ تو منظور منی

"اما ناسخ نقوش مانوی امیر خسرو دہلوی کہ معاصر شیخ سعدی است بانی

(فروع گوئی اگر دیدۂ ساس آں را بلند ساخت ؟

عشق و ہوس بازی میں جو حالات پیش آتے ہیں۔ اُن کے ادا کرنے کو فروع گوئی کہتے ہیں۔ اہل لکھنؤ نے اس کا معاملہ بندی نام رکھا ہے۔ بہرحال اس طرز ادا کے موجد جیسا کہ آزاد نے لکھا امیر خسرو ہیں۔

شرف قزوینی۔ ولی دشت بیاضی۔ اور وحشی یزدی نے اس کو ترقی کی حد تک پہونچا دیا۔ آزاد نے فروع گوئی کی مثال میں امیر خسرو کے یہ اشعار پیش کئے ہیں

خوش آں زباں کہ بر دہش نظر نہفتہ کنم	چو سوئے من نگرد او۔ نظر بگردانم
غلام آں نفسم کامدم چو خانۂ او	بخشم گفت کہ ازود کشید بیرونش
چو رفتم بردرش بسیار۔ در دل گفت ابر سکیں	گرفتار است شاید کیں طرف بسیار می آید

امیر صاحب کے کلام کے زیادہ تفحص سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ہر قسم کے نازک و لطیف اور شوخی آمیز معاملات ادا کئے ہیں۔

چند گویند کہ گہ گہ بہ دلش میگذری	ایں حدیثے ست کہ بر دل ما دیر کند

یعنی لوگ کہتے ہیں کہ خسرو! تم کو وہ کبھی کبھی یاد کرتا ہے لیکن یہ بات تو لوگ تسلی دینے کے لئے بھی کہہ دیا کرتے ہیں۔ اس لئے کیونکر اعتبار آئے۔

جانا! اگر شبیست دہن بر دہن نہم	خود را بجواب سازو مگوکیں ہاں کیست

معشوق سے کہتے ہیں کہ اگر میں کبھی رات کو تیرے منہ پر منہ رکھدوں تو اپنے آپکو سوتا بنا لینا۔ یہ نہ کہنا کہ ارے یہ کس کا منہ ہے۔

دل من مست بود و تشنہ دوست   گہ ز انجام و گہ ز آغاز میگفت

اندک اندک گہ یار و بے جوش بود   در میسر گر دو دم بیاد بودن ہم غرض است

تو خبیبہ می نمانی بہ بیہ کہ بودی اے شب   کہ ہنوز ز چشم مستت اثر خمار دارد

مستان وفتم کہ شب گری خویشم دیر گفت   کیست ایں؟ گفتند مسکینے گدائی میکند

جاں باد فدات آں دم کز بعد و دعہ تو   گویم کہ یکے دیگر، گوئی تو کہ نتوانم

وعدہ میخواہم و در بند وفا نیز نیم   غرض آنست کہ لب را بتقاضا باشم

روزمرہ اور عام بول چال

عموماً شعرا اور اہل فن اپنے کلام کا رتبہ عام بول چال سے برتر سمجھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک جداگانہ زبان پیدا ہو گئی ہے جس کا نام علمی زبان ہے۔

سعدی و نظامی وغیرہ کی زبان اگر بولنے کی قلمبند کی جاتی تو بوستاں اور سکندر نامہ کی زبان سے صاف الگ نظر آتی۔ بلکہ آج اگر اُس عہد کی بول چال کی کوئی کتاب ہاتھ آجائے تو ہم کو سمجھنے میں دقت ہو گی۔ لیکن یہ شاعری کا بہت بڑا نقص ہے۔ بے شبہ شاعری اور عام تصنیف میں ایسے بہت سے مضامین اور خیالات ادا کرنے پڑتے ہیں جو عام زبان میں ادا نہیں ہو سکتے۔ اس لئے ان کے لئے علمی الفاظ وضع کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے لیکن یہ ضرور نہیں کہ ضرورت کے علاوہ اور موقعوں پر بھی یہی مصنوعی زبان استعمال کی جائے خصوصاً غزل کی زبان روزمرہ اور عام بول چال ہونی

چاہئے۔ کیونکہ عاشق و معشوق علمی زبان میں باتیں نہیں کرتے۔

قدما میں فرخی اور متوسطین میں سعدی اور امیر خسرو نے خاص اس کا خیال رکھا کہ روزمرہ اور عام بول چال کو زیادہ وسعت دی جائے۔ سعدی اور خسرو کے کلام میں جو روانی، شستگی اور صفائی پائی جاتی ہے اس کا ایک بڑا گر یہی ہے۔

امیر صاحب کی غزلیں اکثر اس زبان میں ہوتی ہیں کہ گویا دو آدمی آپس میں بیٹھ کر بالکل بے تکلف اور سیدھی سادی باتیں کر رہے ہیں۔ اس میں کہیں کہیں خاص خاص محاورے بھی آ جاتے ہیں جو آج ہم کو اس لئے کسی قدر نامانوس معلوم ہوتے ہیں کہ ہم کو اُس زمانہ کے روزمرہ کے محاورات و تعیت نہیں۔

دل بسے بردۂ۔ نکو بشناس ، آں کہ مجروح تر از اں من است

یعنی تم نے بہت سے دل لئے ہیں۔ خوب غور کر کے دیکھو۔ جو بہت زخمی ہو وہی میرا دل ہے۔

صبح روئے تو بدنیساں کہ برآمد امروز | نیست امکاں کہ چو من سوختہ تا شام کشد[1]
لب و دہاں و رخت ہر یکے بلائے دل اند | یکے دلم چہ کند۔ جانب کدام شود

یعنی تیرا لب وہن اور چہرہ سب بلا ہیں میرا دل کیا کرے۔ کدھر کدھر جائے

گفتم اے دل مرو آنجا کہ گرفتار شوی | عاقبت رفت ہماں گفتۂ من پیش آمد[2]

---

[1] تا شام کشد یعنی شام تک زندہ رہ جائے [2] یعنی رہی میرا کہا سامنے آیا ۱۲

غلطے براہ منتظر جاں سپردن اند　　اے ترک نیم مست عناں را کشیدہ تر
ذرا باگ کو روک کے ہوئے

بوسہ گفت و زباں گردانید　　خود ہمی گوید و سخن گرداند
بوسہ دینے کو کہا۔ اور پلٹ گیا۔ آپ ہی کہتا ہے اور آپ ہی پلٹ جاتا ہے۔

بوئے خوشم آید از تو در جیب　　گل داری یا ہمیں ست بوئیت
تیرے بدن سے خوشبو آرہی ہے۔ تیری جیب میں پھول ہے یا تیری بو ہے۔

خشک سالیست دریں عہد وفا رائے فلک　　زاں حوالی کہ تو می آئی باراں چوں است

اے گل دہن تنگت صد تنگ شکر چیزے　　گل با تو نمی ماند در حسن مگر چیزے

گویم غم و دردم میں گوئی کہ بتر خواہم　　بسم اللہ اگر خواہی زیں ہر دو بتر چیزے

چو سبزہ خویش را خط تو خواند جائے آں باشد　　کہ گل از خندہ بر خاک او فتد غنچہ شکم گیرد
یعنی سبزہ جب تیرے خط کی برابری کرے تو یہ زیبا ہے کہ پھول ہنستے ہنستے زمین پر لوٹ جائے اور غنچہ کے پیٹ میں بل پڑ جائیں۔

دلم میخواستی بر ہم عفاک اللہ چناں بدی　　مرا میخواستی رسوا بحمد اللہ کہ آں ہم شد

اے صبا دی کہ فلانے بچمن مے میخورد　　ہیچ یاد من گم گشتہ زندانی کرد

از کجا آمدی اے باد کہ دیوانہ شدم　　بوئے گل نیست کہ می آید ایں بوئے کسی است

دل من دور نہ رفت ست نگو میدانم | باز جوئیدہ ہمیں جائے کہ در کوی کسی ست

شبنہ می شود دم قبلہ ز رویت چہ کنم | گر ز ابروے تو چشم بد بمحراب افتاد
تیرا چہرہ دیکھ کر تکبیر قبلہ میں سجدہ کا سایہ آگیا ہے | کیونکہ مجکو تیری ابروئے ہمیں محراب نظر آتی ہے

رخ جملہ را نمودہ دم اگلنت تو مبین | زین وقت ست بہ بخیرم کان سخن چہ بود
سب کو منہ دکھلایا اور مجھ سے کہا کہ تو نہ دیکھ | میں اس مزہ میں بیہوش ہوں کہ کیا بات کہدی

ساکناں سر کوے تو نباشند بہوش | کاین نشیمنے است کہ آنجا ہمہ مجنوں خیزد
ز چشمت کار دین صبر من تاراج کافر شد | مسلماناں کسے دیدست کاندر شہر راہ زند
مسلمانوں کسی نے شہر میں بھی ڈاکہ پڑتے دیکھا ہے

بہ بازی گمے من آمد شوخی دل از من بستد | برو گفتم چہ خواہی گر دگر گفتا کار می آید
عام محاورہ بکار آید ہے بکار می آید امیر صاحب کے سوا اور کسی کے کلام میں نظر سے نہیں گذرا۔

حسن تو عالمے بخواہد سوخت | ہم در آغاز می تواں دانست
نرخ کردی بہ بوسۂ جانے | بندہ بخرید و رائیگاں دانست
(تو نے ایک بوسہ کی قیمت جان قرار دی | میں نے خریدا اور یہ سمجھا کہ مفت لیا)
از بہر آں کہ لاف جمال تو میزند | صد بار لالہ بر دہن ما سیاہ بست

ما جاں فدائے خنجر تسلیم کردہ ایم خواہی بخش خواہ بکش رائے رائے تست

ساقی بیار می کہ چناں سوخت دل ز عشق کز سوز ایں کباب ہمہ خانہ بو گرفت

راسست کردی ز ابروان محراب می نماید نماز خواہی کرد

(ابروؤں سے تو نے محراب درست کی ہے معلوم ہوتا ہے کہ نماز پڑھنے کا ارادہ ہے)

من آن ترک طناز را می شناسم من آں مایہ ناز را می شناسم

شبم تازہ شد جاں بہ نغمہ مستی تو بودی من آواز را می شناسم

باد صبا چو از رخ او زلف در ربود ابر سیہ کشادہ شد و آفتاب کرد

تو حال من ہم از ایں روئے زرد بیں دل بر کہ من بروئے تو پیدا[1] نمیتوانم کرد

سالہا شد کہ نیابم خبرے در کویت دل ویراں شدہ را آیم و آواز کنم

من از سر زندہ گردم گر تو یار ایک سخن گوئی تو میدانم نگوئی لیک من گفتار میگویم

مجھکو معلوم ہے کہ تم نہ کہو گے لیکن میں بات کہتا ہوں

---

[1] پیدا کردن۔ ظاہر کرنا ۱۲

دعوائے خونبہائے دل خویش میکنم — یک بوسہ بر لبم زن و مالاکلام کن

امیر صاحب نے ایسے بھی بہت سے محاورے باندھے ہیں جو ان کے سوا اور اہل زبان کے کلام میں نہیں ملتے۔ مثلاً

از گرو او چہ میرود۔

آواز کردن۔ پکارنا۔

گفتار میگویم۔ یوں ہی اک بات کہتا ہوں۔

مالاکلام کردن۔ کسی کو ساکت اور بند کرنا۔

اس بات نے بدگمانوں کو موقع دیا ہے کہ یہ ہندوستان کی سکونت کا اثر ہے کہ ہندی محاورے ان کی زبان سے نکل جاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو۔ لیکن چونکہ ہم کو اپنے تتبع اور استقرار پر اعتماد نہیں اس لیئے ہم اس بدگمانی میں شریک نہیں ہو سکتے۔

مسلسل غزلیں غزل کا یہ بڑا عیب تھا کہ کسی مسلسل خیال کو ادا نہیں کرتے تھے۔ قصائد کا موضوع مدح ہے۔ مثنویاں قصے یا اخلاق کے لئے مخصوص ہیں۔ قطعات میں بھی اور اور باتیں ہوتی ہیں۔ عشق اور محبت کے معاملات میں تفصیلی حالات بیان کرتے ہوں تو کیونکر کریں۔ اس کے لئے صرف مسلسل غزل کام دے سکتی ہے۔ لیکن قدما بلکہ متاخرین میں بھی اس کا رواج بہت کم ہوا۔ امیر صاحب نے البتہ

اکثر مسلسل غزلیں لکھی ہیں اور خاص خاص کیفیتوں کا نقشہ اس خوبی سے کھینچا ہے کہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

مثلاً عاشق، قاصد یا اپنے راز دار سے معشوق کا حال پوچھتا ہے کہ کہاں ہے؟ اور کن لوگوں کے ساتھ ہے؟ کیا کرتا ہے؟ میرا بھی کچھ ذکر کرتا ہے کہ نہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ دیکھو کس اشتیاق کس حسرت کس انداز سے یہ باتیں پوچھتے ہیں۔

اے صبا باز مبن گوی کہ جاناں چوں است؟ | آن گل تازہ وآں غنچۂ خنداں چوں است!
باکہ مے میخورد آں ظالم دورے خوردن | آں رخ پرخوے وآں زلف پریشاں چوں است؟
چشم بدخوش کہ ہشیار نباشد مست | چشم میگونش کہ دیوانہ کند آں چوں است؟
روے دو زلف بت عیار کہ آں ہر دو خوش اند | دل دیوانۂ من پہلوی ایشاں چوں است؟
روز ہا شد کہ دلم رفت دراں زلف بماند | یارب آں یوسف گم گشتہ بزنداں چوں است؟

پوچھتے پوچھتے دفعتہً خیال آتا ہے کہ معشوق کے ذکر میں اپنا تذکرہ خلاف عاشقی ہے اس لئے ان سب باتوں کو چھوڑ کر کس محویت سے کہتا ہے۔

ہم بجان در سر جانان کہ کم ازبیش مگوے | گر ہمیں یک سخن است کہ جاناں چوں است!

یعنی معشوق کی جان کی قسم ادھر اُدھر کی باتیں نہ کہہ۔ صرف یہ بتا کہ معشوق کس حالت میں ہے۔

معشوق نے روزہ رکھا ہے۔ اُس پر عاشق کے دل میں جو جو خیالات

پیدا ہو سکتے ہیں اُن کو دیکھو کس طرح ادا کیا ہے۔

ای خوش آں روزہ کہ جا در لب جاناں دارد	ما من، روزہ میاں شکرستاں دارد
ای مسلماناں! کس روزہ بدنساں دارد	لب نے آلودہ دہاں پر شکر و نرگس مست
کاں پسر در تہ لب چشمۂ حیواں دارد	خضر گر بر لبش آید، شکند روزۂ خویش
من گر فتم کہ خود او روزہ پنہاں دارد	می خورد آخر زمنش پنہاں نیست
قدمے آب دو چشم و دل بریاں دارد	جان من گر تو قدم رنجہ کنی، بندۂ تو

معشوق سر و ساماں کے ساتھ سوار آرہا ہے۔ عاشق پر حیرت طاری ہوتی ہے کہ کیا آسمان سے چاند اتر آیا ہے! یہ خوشبو کیسی پھیل رہی ہے؟ کیا ہوا پھولوں میں بس کر آرہی ہے؟ پھر خیال آتا ہے کہ نہیں۔ معشوق آرہا ہے۔ لیکن ان دلفریبیوں کے ہوتے کس کا ایمان سلامت رہے گا۔ اسلامی آبادی میں یوں نہیں آنا چاہیئے۔ ان خیالات کو مسلسل ادا کرتے ہیں۔

چو گر و استانیکہ میخیزد کہ با جانش ہمیں آید	کہ می آید؟ چنیں یارب اگر مہ بر زمیں آید
کہ امیں بادی چنیں کہ بوے یاسمیں آید	کہ می راند جنیبت را کہ میداں عنبر آگیں شد
کہ در شہر مسلماناں نباید ایں چنیں آید	بتے وآفت تقوی و آخر ایں نمی دانی

بہار آئی ہے۔ عاشق باغ میں جاتا ہے۔ مجلس آرائی کے ساماں ساتھ ہیں۔ قاصد کو معشوق کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجتا ہے کہ باغ میں عجیب بہار ہے۔ سبزۂ لب جو۔ اور عالم آب کی سیر قابل دید ہے۔ قاصد سے یہ بھی

کہدیا ہے کہ ادھر اُدھر کی باتوں میں نہ آنا چاہے تو نہ ماننا جس طرح ہو سکے ساتھ لانا۔ اور اگر مستی میں ہو تو اُسی طرح مست اُٹھا لانا۔ ان تمام خیالات کو تفصیل کے ساتھ ایک غزل میں ادا کیا۔

آمد بہار و شد چمن و لالہ زار خوش ۔۔۔ وقتست خوش بہار کہ وقت بہار خوش

در باغ با ترانۂ بلبل دریں ہوا ۔۔۔ مستی خوش است و بادہ خوش است و بہار خوش

مائیم و مطربے و شرابے و محرمے ۔۔۔ جائے بزیر سایۂ شاخ چنار خوش

اے باد کاہلی مکن و سوے دوست رو ۔۔۔ مارا بکن بآمدن آں نگار خوش

چیزے دگر مگو سے ہمیں گو کہ در چمن ۔۔۔ سبزہ خوش است و آب خوش و جویبار خوش

گر خوش کند ترا بحدیثے کہ باز گرد ۔۔۔ پیشش مکن درنگ و مشو زینہار خوش

در صحبتیکہ مست بود خفتنش مدہ ۔۔۔ ہم صحبتانش مست بہ نزد من آر خوش

من مست خوش حریف و ادیم کہ آں حریف ۔۔۔ سر خوش خوش است مست خوش است و ہشیار خوش

با او دراں زماں کہ خوشش بادہ می دہم ۔۔۔ بازی خوش است بوسہ خوش است و کنار خوش

سرو پیادہ خوش بود اندر چمن ولیک ۔۔۔ آں سرو من پیادہ خوش است و سوار خوش

بہار میں کیا کیا چاہئے ! اسکو تفصیل سے لکھتے ہیں۔

ہنگام گل ست بادہ باید ۔۔۔ ساقی و حریف سادہ باید

گر غنچہ گرہ در ابرو افگند ۔۔۔ پیشانی گل کشادہ باید

حاشیہ ۵ وقت کسے خوش بودن۔ دعائیہ جملہ ہے۔ یعنی خدا انکو خوش و خرم رکھے ۱۲ منتخب ۱۲

ساقی برخیز - دیار نشاں کیں شستہ وآں ستارہ باید
وانگاہ حریف سادہ دست درخنگ من افتادہ باید

بہار کا سامان

بوستاں جلوہ درگرفت اینک گل زرخ پردہ درگرفت اینک
آتش لالہ برفروخت زباد دامن کوہ در گرفت اینک
بلبل آمد نشست برسر گل بے نوا بودہ - زرگرفت اینک
غنچہ در پیش فاختہ زاصول[1] سبقے تازہ برگرفت اینک
ورق غنچہ راکہ ترشدہ بود درقش یکدگر گرفت اینک
یعنی غنچہ کے ورق چونکہ نم تھے اس لئے چپک کر رہ گئے۔
آب راگرچہ چشم ہا پاک است بوستاں را بہ برگرفت اینک
یعنی پانی گو پاک نظر ہے تاہم اُس نے باغ کو سینہ سے لپٹا لیا۔
خار چوں تیز کرد پیکاں را گل بصد نو سپر گرفت اینک
طوطی آغاز شعر خسرو کرد نے گل در شکر گرفت اینک

جدت جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔ امیر صاحب کا دعوےٰ ہے کہ انہوں نے سیکڑوں نئی تشبیہیں ایجاد کیں - اور یہ دعویٰ بدیہی دعویٰ ہے - ان کی ایک غزل بھی نہیں مل سکتی جس میں کوئی نہ کوئی جدید تشبیہ نہو۔

---

[1] موسیقی

چند مثالیں ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں۔

راز خون آلود خویش اے دل مند با من بروں
ایں ورق خام است حرف از وے بروں خواہد گذاشت

اے دل اپنا بھید مجھ سے نہ کہہ۔ کیونکہ یہ کاغذ کچا ہے اس میں حرف پھوٹ نکلے گا۔

زلف او پہلو خال لب او — گوئی از شہد مگس می راند

نہ رود مہ بر اوج در شب تار — تا ز زلف تو نردبان نہ برد

یعنی چاند اندھیری رات میں بلندی پر نہیں چڑھ سکتا۔ جب تک تیری زلفوں کی سیڑھیاں نہ لگائے۔ (چہرہ کو چاند اور زلف کو زینہ سے تشبیہہ دی ہے)

ہست صحرا چوں کف دست دراز لالہ جام — خوش کف دستے کہ چندیں جام صہبا برگرفت

اس مضمون کو دانش مشہدی نے عجیب لطیف پیرایہ میں بدل دیا ہے۔

دیدہ ام شاخ گلے برخویش می پیچم کہ کاش — می توانستم بیک دست اینقدر ساغر گرفت

یعنی میں نے ایک ڈالی پھولوں سے بھری دیکھی۔ اور تڑپ گیا کہ کاش میں ایک ہاتھ میں اتنے ہی پیالے لے سکتا۔

غلام نرگس مستم کہ با مداد پگاہ — قدح بدست گرفتہ زخواب برخیزد

گلستان نسیم سحر یافتہ است   صبا غنچہ را خفتہ در یافتہ است

چناں خواب دیدہ است نرگس بخواب   کہ گویا یکے جام زر یافتہ است

نرگس کے پھول میں جو زرد کٹوری ہوتی ہے اس کو جام زر سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اور یہ تشبیہ عام تھی۔ لیکن اس اسلوب بیان نے کہ نرگس نے خواب میں دیکھا کہ اُس کو جام زر ہاتھ آگیا ہے۔ ایک خاص لطف پیدا کر دیا۔ اور چونکہ نرگس کو مخمور اور خواب آلود باندھتے ہیں۔ اس لئے خواب دیکھنے کی توجیہ واقعیت کا پہلو رکھتی ہے۔

میروی و گریہ مے آید مرا   ساعتے بنشیں کہ باراں بگذرد

آنسو کی جھڑی کو سب بارش سے تشبیہ دیتے آئے ہیں۔ لیکن یہ بالکل نیا اسلوب ہے کہ معشوق سے کہتے ہیں کہ تیرے جانے کے وقت مجھ کو رونا آتا ہے اتنا ٹھہر جا کہ بارش تھم جائے۔

مزید لطف یہ ہے کہ معشوق کا جانا ہی اس بارش کی علت ہے اس لئے وہ جانا چاہے گا تو بارش ہوگی۔ اور وہ اس لئے کبھی نہ جا سکے۔

مے میان شیشۂ ساقی نگر   آتشے گویا بہ آب آلودہ اند

ابر آمد و بہ ساغر لالہ خراب کرد   در گوشہ ہاے باغ بسے در نایاب کرد

فراش باغ بار گہ خود بباغ زد   تا نگہ بر آب حر گہ سیم از حباب کرد

نرگس کہ شب نخفت ز فریادِ بلبلاں　　بنہاد سر بہ بالش گل میل خواب کرد

مضمون آفرینی خیال بندی اور مضمون آفرینی کا موجد کمال اسمٰعیل خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن کمال کی جدت قصائد کے ساتھ مخصوص ہے۔ غزل میں اس نے اس رنگ کی مطلق آمیزش نہیں کی ہے۔ غزل میں نئے نئے مضامین اور نئے نئے اسلوب پیدا کرنا آسیرؔ غنا کی ایجاد ہے اور انھیں پر خاتمہ بھی ہو گیا۔ متاخرین کی مضمون آفرینیاں گو حد سے بڑھ گئیں لیکن اس کا دوسرا انداز ہے۔ وہ اور سلسلہ کی چیز ہے چنانچہ آگے چل کر اس کی حقیقت کھلے گی۔

امیر صاحب کی مضمون آفرینیاں مختلف قسم کی ہیں۔ مثالوں سے اندازہ ہو گا۔

بہ خانۂ تو ہمہ روز بامداد بود　　کہ آفتاب نیارد شدن طنبہ بجا[1]

تیرے گھر میں ہمیشہ صبح رہتی ہے　　کیونکہ وہاں آفتاب اونچا نہیں ہو سکتا

زلف تو سیہ چراست ؟ مانا　　بسیار در آفتاب گشتہ است

شنبہ می شودم قبلہ ز رو ئیت چہ کنم　　کہ ز ابروے تو چشمم بدر محراب افتاد

چشم مستِ تو کہ دی بر من بیتاب[2] افتاد　　تو نیگفندی از آلودگی خواب افتاد

---

[1] غالباً ہ[2] دھوپ میں پھری ہے ۱۲

ز بہر آں جبیں تاریک باشد خانہ چشمم　　　کہ ہرگز آفتاب من دریں روزن نمی آید

پیش تو آفتاب نتواں جست　　　روز روشن چراغ نتواں کرد[1]

می روی دگر بہ می آید مرا　　　ساعتے بنشیں کہ باراں بگذرد

دل من بہ زلف در دیست شدہ اسیر چوں نگرد　　　شب ماہتاب دزدے کہ بخانہ در آمد

زہے عمر دراز عاشقاں گر　　　شب ہجراں حساب عمر گیرند

یعنی اگر شب ہجر کو بھی شامل کر لیا جائے تو عاشقوں کی عمر کس قدر بڑی ہوتی ہے

زلف از اں می بُرد آں شوخ کہ شبہائے غم　　　گر شود کوتہ از آں جا بہم پیوند کند

یعنی اپنی زلف وہ اس لئے تراشتا ہے کہ میرے غم کی راتیں چھوٹی ہو جائیں تو ان میں جوڑ لگا کر بڑھا دے۔

راہے است برائے بردن دل　　　ابروئے تو گر میاں کشادہ است

یعنی تیری دونوں ابروؤں کے درمیان جو فاصلہ ہے۔ اس لئے کہ دل لیجانے کے لئے راستہ رہے

زلفت سر و پا شکستہ زاں است　　　کز فرق بلندت اوفتاد است

---

[1] چراغ کردن۔ چراغ جلانا ۱۲

یک شب ز رخ خویش چراغیم کرم کن تا قصۂ اندوہ تو ہم پیش تو خوانم
(یعنی کسی رات کو اپنے چہرہ کا چراغ عنایت کرو کہ میں اس کی روشنی میں اپنا قصہ تمہارے سامنے پڑھ کر سناؤں)

خانۂ چشم من خراب شدہ ست کہ بہ بنیاد خانہ نم رفتہ است

کسے نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

شکریں لعل تو کان نمک است گرچہ شکر نہ مکان نمک است
آب روئے تو ملاحت افزود گرچہ از آب زیان نمک است

خواہی اے جان بر دخواہ من باش کہ من مردنی نیستم امروز کہ جانان اینجا است

آئینہ کرد حسن وے از آسماں سوال برخاست آفتاب بہ زانو جواب کرد
(یعنی اس کے حسن نے آسمان سے آئینہ مانگا۔ آفتاب نے ادب سے زانو ٹیک کر کہا کہ حاضر ہے)

سرا بروے تو گردم گرہش باز کشای کہ کمانت نہ باندازۂ بازوی کسی است

ہر چند کہ زلف تو سیاہی است جہانگیر زیں گونہ پریشان نتواں کرد سپہ را

بہ سایہ خفتہ بدم من کہ یار آمد و گفت چہ خفتہ کہ رسید آفتاب در سایہ

اکثر شاعرانہ اجتماع النقیضین ثابت کرتے ہیں اور وہ طبیعت پر استعجاب کا اثر پیدا کرتا ہے۔

ع۔ دردہا دادی و درمانی ہنوز۔

ع - یاد باد آنکہ ہمہ عمر نہ کردی یادم۔

امیر صاحب نے اعجاز خسروی میں صنائع و بدائع پر اس قدر ہمت صرف کی کہ ہم کو بڑا ڈر تھا کہ جو جال انھوں نے بچھایا اس میں خود نہ پھنس جائیں۔ لیکن یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ جن جن لوگوں نے صنائع و بدائع کو فن بنایا اور اس پر مستقل کتابیں لکھیں۔ مثلاً فرخی و ابن المعتز وغیرہ وہ خود اس بدعت سے محفوظ رہے۔

امیر صاحب اوروں کی بہ نسبت کسی قدر آلودہ ہیں۔ تاہم ان کے صنائع بہت سے بے تکلف بھی ہوتے ہیں اور اس حد تک نہیں پہونچتے کہ نکتہ گیری کی زد میں آجائیں۔ صنعت طباق یعنی اضداد ان کی خاص مرغوب چیز ہے اور وہ اس کو بڑی خوبی سے نباہتے ہیں۔ ع

دردہا دادی و درمانی ہنوز۔

زبند دو جہاں آزاد گردم — اگر تو ہمنشیں بندہ باشی
من درویش را کشتی بغمزہ — کرم کردی الٰہی زندہ باشی

گفتیم ناخوش چرائی خسروا — چوں کنم؟ آں گلِ ہوس با ناخوش است

بندہ را در غم تو نیست خبر — ہمہ یاراں بندہ را خبر است

خردسالے بمن کند بیداد — اے بزرگاں شہر داد دہید

عربیت اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ امیر صاحب کو عربی علم ادب میں کمال تھا اور اس فن کی نادر کتابیں ان کے حافظہ میں مخزون تھیں۔ تاہم ان کو اس فن میں دعوےٰ نہیں۔ غرّۃ الکمال کے دیباچہ عربی کے چند اشعار لکھے ہیں جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ باوجود اعتراف عجز کے ان کو اس زبان پر کس قدر قدرت ہے۔ اشعار یہ ہیں۔

ذاب الفواد وسال من عینی الدم — جلی الجلد وامعکل ما انا اکتم
دل پگھل گیا۔ اور آنکھوں سے خون بہا — اور آنسوؤں نے وہ سب کہدیا جو میں چھپاتا تھا

واذا بحثت لکل الوریٰ کرب النویٰ — بنکی الاحبۃ والاعادی ترحم
اور جب میں لوگوں کے سامنے فراق کی تکلیف بیان کرتا ہوں تو دوست روتے ہیں اور دشمنوں کو رحم آتا ہے

یا عاذل العشاق عنی کیا ان السکون علی المحب محرم

او ناصح! تو مجھے روسنا رہے چپ رہنا عاشق پر حرام ہے۔

من بات مثلی فیتوید خلیلتہ طول اللیالی کیف بات متیم

جو شخص میری طرح رات گذارے وہ البتہ سمجھ سکتا ہے کہ عاشقوں کی رات کسطرح گذرتی ہے

اعجاز خسروی میں عربی زبان میں خطوط لکھے ہیں جن سے اُن کی عربیت

کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ اگرچہ ان میں قافیہ بندی اور لغو تکلفات ہیں لیکن

یہ اس زمانہ کا عام انداز تھا۔ تنہا ان پر الزام نہیں آسکتا۔

وان انا الا من غزیۃ ان غوت غویت وان ترشد غزیۃ ارشد

میں بہر حال قبیلہ غزیّہ کا آدمی ہوں غزیّہ گمراہ ہے تو میں بھی گمراہ ہوں اور وہ ٹھیک راستہ

پر ہے تو میں بھی ہوں۔

صنائع و بدائع امیر صاحب نے صنائع و بدائع میں جو زور آوریاں صرف کیں اگرچہ کوہ کندن و کاہ برآوردن ہیں۔

لیکن اس لحاظ سے کہ ان کی محنت بالکل رائیگاں نہ جانے پائے۔

ان کا اجمالی تذکرہ کرنا ضرور ہے۔

ان میں بہت سی صنعتیں وہ ہیں جو عربی میں موجود تھیں۔ لیکن

فارسی میں ان کا ادا کرنا اس لئے مشکل تھا کہ فارسی زبان کی کم وسعتی

اس کی متحمل نہیں ہوسکتی مثلاً صنعت منقوطہ یعنی عبارت میں ایسے الفاظ

لا ناجن کا ایک ایک حرف نقطہ دار ہو۔ امیر صاحب نے اس قسم کی صنائع میں صفحے کے صفحے لکھے ہیں۔ بعض فارسی میں بھی۔ لیکن ایک آدھ سطر سے زیادہ کوئی شخص نہ لکھ سکا۔ امیر صاحب نے ذرہ ترقی کے آگے بعض صنائع میں انھوں نے تصرفات کیے۔ اور بعض بالکل خاص ان کی ایجاد ہیں۔ چنانچہ ہم انھی کو مختصر طور پر لکھتے ہیں۔

ذو لُغتین ۔ یعنی ایسی عبارت لکھنی کہ لفظوں کے ردوبدل سے دو مختلف زبانوں میں پڑھی جا سکے اور بامعنی ہو۔ امیر صاحب نے اس صنعت میں کئی صفحے لکھے ہیں۔ لیکن کاتبوں کی غلط نویسی سے ان کا صحیح پڑھنا ناممکن ہو اس لئے صرف ایک آدھ سطر پر اکتفا کرتا ہوں۔

رسیدی۔ بدیدی۔ مرادی نجانی زمانے بیاشی۔ بیاری بشائی

اس شعر کو اگر فارسی میں پڑھیں تو اس کا لفظی ترجمہ یہ ہے۔ کل تو آیا اور تو نے مجکو ایک مکان میں دیکھا۔ ایک ذرا ٹھہر جا۔ تو دوستی کرنے کے قابل ہو۔ لیکن اگر اسی کو عربی میں پڑھیں تو یوں پڑھ سکتے ہیں۔

رشیدی۔ نذیدی۔ مرادی نجاتی زمانی بیاس بتادی نسائی

"تو میرا ہدایت یافتہ ہے۔ بے نظیر ہے۔ میری مراد ہے۔ میری نجات ہے" مجکو اس بات نے ناامید کیا کہ عورتیں باہم لڑتی ہیں۔

قلب اللسانین ۔ بہت اشعار لکھے ہیں کہ فارسی میں ہیں۔ لیکن اگر

ان کو الٹ کر پڑھیں تو عربی عبارت بنجائے۔ مثلاً

بسی باکامرانی در جہاں باش۔
می باش بکار شادمانی،
با ہی یار ماکہ کار می کنیم بہم۔
دوست ما یار منی بہ بار ہی ما آئی۔
بکن داد دبکشود کامراں باش۔

ان تمام مصرعوں کو الٹ کر پڑھیں تو عربی عبارت بنجاتی ہے۔

وصل الحرفین۔ یہ وہ صنعت ہے کہ جس قدر الفاظ عبارت میں آئیں ان میں کہیں کوئی حرف الگ نہ آئے۔ بلکہ دو دو۔ یا تین تین حرف کا لفظ ہو مثلاً۔

چاکر۔ خاصہ۔ حاجی شرفانی۔ سرخدمت۔ برابیت می مالد۔ و می گوید۔ کہ بدیں جانب خاطر ما بافرحت قریں می باشد باید کہ گہ گہ جانب ما نامہ فرماید، تا ہر خوشی کہ بر ماست فرخی کامل باید

اِس صنعت کا نقیض ہی جس کا ہر لفظ الگ الگ حرفوں میں لکھا جاتا ہے مثلاً

در۔ دور۔ دواد۔ آورد۔ روداد۔ داری۔ دراری۔ دوّلہ۔ ذات دادر دوران را۔ الخ۔

امیر صاحب نے اس صنعت پر کئی صفحے کی عبارت لکھی ہے۔

اربعۃ الحرف اس صنعت پر امیر صاحب کو بہت ناز ہے کئی کئی سطروں کی بامعنی عبارت لکھی ہے۔ اور یہ التزام کیا ہے کہ صرف چار حرف یعنے الف۔ ہ۔ واو۔ یے کے سوا اور کوئی حرف نہ آنے پائے۔ یعنی تمام الفاظ صرف انھی حرفوں سے بنے ہیں۔ لیکن جو عبارت لکھی ہے۔ وہ بالکل سہل معلوم ہوتی ہے۔ اور اس کا پڑھنا سخت مشکل ہے۔

معجزۃ الالسنۃ والشفا اس صنعت پر بھی ان کو ناز ہے۔ اس میں ایسے الفاظ جمع کئے ہیں کہ سطروں کی سطریں پڑھتے جاؤ۔ لیکن کہیں ہونٹوں کو جنبش نہیں ہوگی۔ صرف حلق سے تمام الفاظ نکلیں گے۔

ترجمۃ اللفظ یہ صنعت بھی خاص ان کی ایجاد ہے اس میں یہ التزام ہے کہ جو لفظ آتا ہے۔ اس کے بعد کا لفظ۔ دوسری زبان کے لحاظ سے پہلی لفظ کا ترجمہ ہو جاتا ہے مثلاً

سودای رخ تو کشت مارا

یہ فارسی مصرع ہے۔ لیکن کشت کا اگر اردو میں ترجمہ کریں تو "مارا" ہوگا۔ اس لیے مصرع اخیر لفظ پہلے لفظ کا ترجمہ بھی ہے۔ امیر صاحب نے اس صنعت میں پورے صفحہ بھر کی عبارت لکھی ہے۔

محتمل المعانی۔ ایک شعر میں ایک لفظ لائے ہیں کہ اس کے سات
معنی ہیں اور ہر معنی وہاں مراد لئے جا سکتے ہیں۔
موقوف الآخر۔ ایک رباعی لکھی ہے جس کا ہر قافیہ۔ دوسرے
مصرعہ کا آغاز کا محتاج ہے مثلاً

در حسن ترا۔ کسے نماند الّا	خورشید کہ ہر صبح بروں آید تا
خدمت کند و پائے تو بوسد۔ امّا	بینی تو لبوے او چہ با بوسد تا

انھی صنعتوں اور بیجا کاوشوں میں کئی جلدیں لکھ ڈالی ہیں۔ اگر
کسی صاحب کو امیر صاحب سے زیادہ مغز کاوی مقصود ہو تو اعجاز
خسروی موجود ہے مطالعہ فرمائیں۔

میناے سخن | امیر مینائی مرحوم کا اس میں وہ کلام ہے جس سے مرحوم کے مشہور دیوان خالی تھے دائرۂ ادبیہ نے بکوشش فراہم کر کے اسے شائع کر دیا ہے۔ کلامِ امیر کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، اسکی مقبولیت خود مشک کی طرح بو دیتی ہے۔ قیمت مجلد عمہ غیر مجلد عہ ر

مکاتیب اکبر | لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی مرحوم کے ڈیڑھ سو خطوں کا مجموعہ مرحوم کی نظموں کی طرح ان کا ہر ایک خط نہایت دلچسپ ظرافت میں سمویا ادب کی رنگ ہوتا ہے مجلد عمہ غیر مجلد عہ

بیگمات بنگال | مرشد آباد بنگال کی بیگموں کا یہ نہایت مستند مختصر تذکرہ ہے، ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے زوال کا جب کمال تھا یہ اس وقت کا عبرت آگین ایک مرقع اور نسوانی مردانہ ہمتوں کا آئینہ ہے قیمت صرف ۶ر

سیاحت زمین | جولیس ورن فرانس کے مقبول و مشہور مصنف کے زورِ قلم کا یہ پرزور دلآمد ترجمہ ہے جس میں واقعات کے قالب میں یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ ۸۰ دن کی قلیل مدت میں ہوائی جہاز بغیر دنیا بھر کی سیاحت کیجا سکتی ہے جغرافیہ وغیرہ کے مختلف مسائل علمی ضمنی طور پر نہایت سہل کر کے سمجھا دیے گئے ہیں قیمت عہر (ہوائی سیاحت بھی اس مصنف کی عنقریب شائع ہو جائیگی)

انسانی قربانیاں | اصلاحی معاشرتی نقطۂ نظر سے ایک شامی انشا پرداز نے درد دل و بیان بکر خونِ جگر سے کتاب کے صفحات رنگے تھے، مولانا محوی کے دردمند المویب قلم نے اس کا ترجمہ اردو میں کر کے اپنی دلسوزی و ادب نوازی کا نمونہ پیش کیا ہے۔ قیمت ۸ر (مولانا محوی کی قومی نظموں کا مجموعہ عنقریب شائع ہونے والا ہے۔

دائرۂ ادبیہ لکھنؤ سے طلب فرمائیے